شرح میر درد

خواجہ محمد شفیع

قیمت دو روپے آٹھ آنے

ناشر
مکتبۂ ادب لال کنواں دھلی

(فاروقی پریس لال کنواں دہلی)

شرح میر دردؔ پر

مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے

خواجہ محمد شفیع دہلی کے رہنے والے ہیں اور نئی دہلی کے دور میں پرانی دہلی کی یاد تازہ رکھنے والے خواجہ میر دردؔ کے کلام کی یہ شرح، شرح دردؔ، اپنے رنگ میں فرد۔ خود انہیں کے قلم کی ہے۔

کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہے ہی، شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہے کہ فصاحت لوٹی جاتی ہے، بلاغت قدم چومتی جاتی ہے۔ دیباچہ کی ابتدا کھجور کے درخت سے ہوتی ہے! جی ہاں کھجور کے درخت سے! ان رسیلی، شربتی، شیرہ ٹپکتی ہوئی لالوں لال کھجوروں کا مزہ تو بعد کو چکھیئے گا۔ ابھی ذرا ہری بھری ٹہنیوں، خوشوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی سیر کرتے چلیئے۔

صحرائے عرب کا نخل، کھجور کا درخت، ہر رگ و ریشہ کام کا، پھول پتی کارآمد، پھل غذا، گٹھلی دوا، جڑیں مضبوط[2]، بلند و بالا[3]۔ استوار[4]۔ باد سموم[5] کے تھپیڑوں سے جھک جائے دم کے دم میں پھر سیدھا۔ مرکز[6] سے جنبش نہیں اپنی بقا کیلئے کم از کم[7] کا طالب، دوسروں کی بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ حیات بخش، فروعات[8] سے معرّی۔ چوٹی پر ایک گتھا ہوا گلدستہ پھول پھلی سب ایک جگہ، یک جہتی اور سلوک کا نمونہ، سایہ[10] دور تک پھینکے۔ جگہ کم سے کم گھیری

برگ[۱۱] و بار کی ہر فصل یا ہر نسل اس کو ایک پوری بلند کر جائے۔ خود سپرد[۱۲] خاک ہو، کھاد بن جائے، آنے والوں کے لئے بلند تر مقام کی بنا بنائے۔" (ص ۱۱)

بارہ کی اس گنتی میں ماہِ ربیع کی بارہویں کی بہار۔ بارہ بُرجوں کے خالق کی قدرت کا رمز اس سے آشکار، نئی تشبیب اور نئی گریز مجاز سے حقیقت کی طرف آیئے، اور لفظی بندشوں میں معنویت کی مٹھاس پایئے:۔

"جس خطہ نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا، اسی دیس سے ایک دین چلا۔ کار آمد فطری[۱] اُصول کا حامل۔ قوی[۲] الاساس۔ رفیع[۳] النظر۔ راستی و راست[۴] بازی کا حامل۔ دب[۵] دب کر اُبھرنے والا مرکز[۶] سے نہ ہٹنے[۷] والا آسانیاں[۸] اور فراخیاں بہم پہنچانے والا، لیکن تسلیم و رضا کا طلبگار۔ فرقہ[۹] بندی سے غیر متاثر۔ وحدت[۱۰] کا پرستار، مرکزیت کا دلدادہ، اتفاق[۱۱] کا حامی، رسم[۱۲] و رواج کی پہنائیوں سے معرّٰی، ہلکا پھلکا دُور رس۔ ترقی[۱۳] کا راستہ دکھانے والا۔ فنا[۱۴] میں بقا کا سبق دینے والا۔ یہ وہ مذہب تھا جو ل رسول عربیؐ لے کر آئے" (ص ۱)

زبان کی ان لطافتوں ادب کی ان نزاکتوں کی جو قدر نہ کرے وہ یقیناً اردو کے بارہ پتھر سے باہر۔
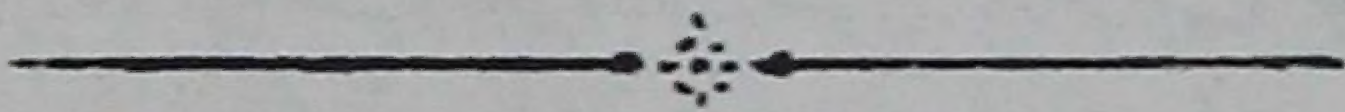
دیگر تصانیف
خواجہ محمد شفیع
دہلوی

شمع خرابات - ایک امیرزادی کی دردناک آپ بیتی اسی کی بولتی ہوئی تصاویر۔ اور پھر ادیبُ الملک خواجہ محمد شفیع کی گنگ وجمن سے دھلی ہوئی زبان میں۔

بہادر شاہ کا خواب :- خواجہ محمد شفیع کے مختلف افسانوں کا مجموعہ، ہر افسانہ ایک مکمل داستان ہے۔ پھر زبان، اندازِ بیان۔ استعارات کی رنگینی۔ پلوٹ کی دلآویزی۔ خواجہ صاحب کے مخصوص انداز کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ قیمت ۱۲/

قلمی پارلیمنٹ :- یہ کتاب خواجہ صاحب کے زورِ قلم کا بہترین نمونہ اور مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ہر بات دل میں بیٹھتی چلی جاتی ہے۔ دلائل و براہین ہاتھ باندھے نظر آتے ہیں اور حسنِ بیان غاشیہ بردار۔

ہم اور وہ :- غدر سے پہلے اور بعد غدر کے ادوار کا موازنہ ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی بابت مولانا عبدالماجد دریابادی نے فرمایا ہے کہ ایسی کتاب کو آنکھیں ترستی ہیں۔

نیا میلاد نامہ :- اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے۔ اپنے طرز کا پہلا میلاد ہے ہر لفظ نصیحت ہے ہر بات پند۔ اور پھر کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان میں۔

دلی کی آوازیں اور پیشے } دلی کے کوچہ و بازار کی سیر کرنی ہو تو بس اس کتاب کو پڑھ لیجئے۔ جو گھر بیٹھے دلی کا نقشہ نظروں میں نہ پھر جائے تو ہمارا ذمّہ۔

ابلیس:۔ دیوانی ماں اور جرائم پیشہ باپ کی اولاد کے واقعات۔ آپ خود سمجھ لیجئے کہ خواجہ صاحب نے کیا کچھ نہ بھر دیا ہوگا۔ ایک مرتبہ کتاب ہاتھ میں اٹھانی شرط ہے پھر ختم کرنے سے پہلے نہیں چھوڑ سکیں گے۔

بازارِ حسن:۔ خواجہ محمد شفیع کے افسانے ہر افسانہ حسن کی ایک تصویر ہے۔ افسانوں کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ان افسانوں کا جواب اردو میں نہیں ہے۔

عشق جہانگیر:۔ عشق اور اکبر اعظم کے بیٹے جہانگیر کا عشق، حسینہ اور مہر النسا جیسی حسینہ بیان اور خواجہ صاحب کا بیان، اول تو داستان ہی رنگین ہے۔ پھر خواجہ صاحب کا طرز نگارش۔ موتی پروئے ہیں جواہر جڑے ہیں۔

مکتبۂ ادب
اردو بازار جامع مسجد دھلی

ہماری دیگر مطبوعات

نام کتاب	نام مصنف	قیمت
علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں	مفتی انتظام اللہ	دو ۲ روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ چمن	تین روپے
ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء	مفتی انتظام اللہ شہابی	دو ۲ روپے
بیگمات اودھ کے خطوط	〃	دو ۲ روپے
آوارہ گرد کے خطوط	ش مظفر پوری کے افسانے	عہ/
جام و مینا	پریم چند وغیرہ کے افسانے	عہ/
ہم اور وہ (علمی مقالہ)	خواجہ محمد شفیع	عیر/
مضامین محشر خیال (حصہ اول)	مرتبہ عبداللہ فاروقی	عہ/
یہ کیا؟ (الفت مہناس بی۔ اے	بی ٹی کا ناول	چار روپے
تفسیر اقبال	حکیم یوسف حسن	صہ/ ۵
رضیہ کراس اسٹیچ	رضیہ سلطانہ چمن	چار روپے
نئے خاکے	قدوس صہبائی	عہ/

نام کتاب	نام مصنف	زیر طبع
سرخ لفافہ	ترجمہ اسرار احمد آزاد	〃
اسلامی معاشرت	مفتی انتظام اللہ شہابی	〃
مضامین محشر خیال حصہ دوم	مرتبہ عبداللہ فاروقی	〃
لالہ رخ	ل احمد اکبر آبادی	〃
لغزش	فضل حق قریشی	〃
رضیہ فیشن بک	رضیہ سلطانہ	〃

رضیہ کٹ ورک	رضیہ سلطانہ چمن	زیرِ طبع
باغی دوشیزہ کی ڈائری	واثق صدیقی	عار
تاریخ مغلیہ خاندان	مفتی انتظام اللہ شہابی	زیرِ طبع
غدر کے چند علماء	"	"
جواہر لال کی کہانی۔ اردو ہندی ہر دو حصّہ	محمد رحیم دہلوی	"
افسانۂ غم	عبداللہ فاروقی	"
مسدّس حالی	الطاف حسین حالیؒ	"
قلمی پارلیمنٹ	خواجہ محمد شفیع	"
اسلامی تاریخی کہانیاں	مفتی انتظام اللہ شہابی	"
الفاروق	شبلی نعمانیؒ	"
جنت میں مشاعرہ	عارف بٹالوی	"
دلی کی آوازیں اور پیشے	خواجہ محمد شفیع	"
لطائف الشعراء	مفتی انتظام اللہ شہابی	"
احکام قرآن	"	"
مغل شہزادے	"	"
قلعہ معلّیٰ کی جھلکیاں	محمد رحیم دہلوی	"
بربط	رضا زیدی	"
رضیہ سلطانہ	مفتی انتظام اللہ شہابی	"
شکوہ جواب شکوہ	علامہ اقبال	"
انقلابی مولوی	محمد رحیم دہلوی	"
ابلیس	خواجہ محمد شفیع	"
آخری بزم	مفتی انتظام اللہ شہابی	"
شہزادی بدر کمال	رضیہ سلطانہ	"
مصطفےٰ کمال	عبداللہ فاروقی	"
ہندوستان ہمارا	رضا زیدی	"

دیباچہ

صحرائے عرب کا نخل، کھجور کا درخت۔ ہر[1] رگ و ریشہ کام کا۔ پھول پتی کارآمد۔ پھل غذا گٹھلی دوا۔ جڑیں[2] مضبوط۔ بلند[3] و بالا۔ استوار[4]۔ باد سموم[5] کے تھپیڑوں سے جھک جائے۔ دم کے دم میں پھر سیدھا۔ مرکز[6] سے جنبش نہیں۔ اپنی بقا[7] کے لئے کم از کم کا طالب۔ دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ حیات بخش۔ فروعات[8] سے معرا۔ چوٹی[9] پر ایک گتھا ہوا گلدستہ۔ پھول پھل سب ایک جگہ یک جہتی اور سلوک کا نمونہ۔ سایہ[10] دور تک پھیلے۔ جگہ کم سے کم گھیرے برگ[11] و بار کی ہر فصل یا ہر نسل اس کو ایک پوری بلند کر جائے۔ خود سپرد[12] خاک ہو کھاد بن جائے۔ آنے والوں کے لئے بلند تر مقام کی بنا بنے۔

جس خطے نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا۔ اس ہی دیس سے ایک دین چلا۔ کارآمد[1] فطری اصولوں کا حامل۔ قوی[2] الاساس۔ رفیع[3] النظر۔ سادگی[4] و راست بازی کا حامل۔ دب[5] دب کر اُبھرنے والا۔ مرکز[6] سے نہ ہلنے والا۔ آسائیاں[7] اور فراخیاں بہم پہونچانے والا۔ لیکن تسلیم و رضا کا طلبگار فرقہ[8] بندی سے متنفر۔ وحدت[9] کا پرستار۔ مرکزیت کا دلدادہ۔ اتفاق کا حامی۔ رسم[10] و رواج کی پہنائیوں سے معرا۔ ہلکا پھلکا

دور رس۔ ترقی[11] کا راستہ دکھانے والا۔ فنا میں[12] بقا کا سبق دینے والا۔

یہ وہ مذہب تھا جو رسول عربیؐ لے کر آئے۔

امتدادِ زمانہ تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ رنگِ روزگار ہر شے کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ ممالک کے اثرات اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ اقوام مذاہب کو اپنے قالب میں ڈھالتی ہیں مختلف طبائع اپنی مہر ثبت کرتی ہیں۔ چیز کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔

اُمّ الکتاب جوں کی توں رہی اور رہے گی۔ متلوّن ذہنیتوں نے نئے نئے راستے نکالے عقل عقیدے میں دخیل ہوئی۔ تفکّروا فی صفات اللّٰہ ولا تفکّروا فی ذات اللّٰہ سے بھٹک گئے عقلِ ناقص سے حقیقتِ کاملہ کے ادراک کے طالب ہوئے۔ چشمِ انسانی سے شاہدِ حقیقی کو دیکھنا چاہا۔ محدود نے لامحدود کو احاطۂ فہم میں لانے کی ناکام کوشش کی۔ شب پرک روزِ روشن میں آئی۔ چندھیا گئی بھٹکتی پھری۔ عقل نے تیرِ تکے چلائے۔ بعض اتفاقیہ نشانے پر جا لگے۔ اکثر و بیشتر نے سادہ لوح راہگیروں کو نخچیر کیا۔ جو مسلک خواص کے لئے بنا تھا عوام میں عام ہوا۔ ظرف تنگ حوصلہ تھے شرابِ تیز و تند۔ سمائی نہ کر سکے۔ پھٹ پڑے۔ راہ سے بھٹک گئے۔ خود بھی گمراہ ہوئے دوسروں کو بھی راستہ بھلا دیا۔

اچھوتا مضمون شعرا کے ہاتھ آیا۔ برائے شعر گفتن خوب بود۔ لے اڑے غزل میں رنگِ تصوف داخل ہوا۔ شراب مئے عرفان بن گئی۔ شاہد شاہدِ حقیقی کے مرادف۔ پیرِ مغاں سالکِ راہِ حقیقت کہلایا۔ جائز ناجائز اور ناجائز جائز قرار پایا۔ ہر شے میں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ فلسفۂ ہمہ اوست نے رنگ جمایا۔ ہمہ از اوست مقابلے پر آیا جبر و قدر نے گاہ مجبور گاہ قادر کر دکھایا۔ دیر و حرم ایک ہوا۔ ناقوس میں بھی اسی کی صدا سنائی دی۔ اذان میں بھی اس ہی کا نعرۂ تکبیر۔ زنّار میں تسبیح کے دانے پروئے گئے۔ عقل نے ریشہ دوانیاں کیں وحدت میں کثرت اور کثرت میں

وحدت کے کرشمے دکھائے. غرضکہ ایسے ایسے گُل کھلائے جن سے آج بھی زمینِ سخن چمن بنی ہے.

تمام تصوف گو شعرا کو دیدارِ خدا نصیب ہے اور ہر شے میں اس کا جلوہ دیکھتے ہیں میرے خیال میں اس طبقے میں کلیم صرف دو ہیں. ایک مولانا روم اور دوسرا اقبال. اُن کو خدا نہ صرف نظر آتا ہے بلکہ کچھ پیغام بھی دے کر جاتا ہے. راستہ بتاتا ہے. روشنی دکھاتا ہے.

خواجہ میر درد کی شاعری اور وہ خود تصوف کی گود میں پلے. پروان چڑھے. اس صنف کے مسلم الثبوت استاد ہیں. جس آسانی. روانی شگفتگی اور برجستگی سے ان مسائل کو وہ بیان کر جاتے ہیں دوسرا نہیں کر سکتا.

خواجہ محمد شفیع دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

اُس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے (۱) کیا تاب گذر ہووے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن (۲) آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی

کھینچا نہ (۳) اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

(۱) تیری بزرگی اور برتری کا ادراک عقل انسانی نہیں کر سکتی۔ وہاں پائے خرد لنگ ہے۔ طائرِ فہم بال و پر بُریدہ۔ مدعا یہ کہ خدا کو عقل سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ دل سے مانا جا سکتا ہے۔ تفکروا فی صفات اللہ ولا تفکروا فی ذات اللہ

(۲) تمام مذاہب عالم تیرے ہی مرہون منت ہیں۔ دیر میں بھی تیرا ہی جلوہ ہے۔ اور حرم میں بھی۔ شیخ یعنی اسلام کا علمبردار بھی تیرے ہی زیر سایہ گذر بسر کرتا ہے اور برہمن بھی تیری ہی نظر کرم کا امیدوار۔ مدعا یہ کہ ہر انسان اپنی روشنی کے مطابق تیرا ہی پرستار ہے اور ہر معبد میں معبود تو ہی ہے۔ ہر سر تیرے ہی آگے جھک رہا ہے، خواہ طریقے الگ الگ ہوں مدعائے حقیقی ایک ہے۔

(۲۳) عرصہ بمعنی میدان ۔ یعنی مدت ۔ شاعر بے ثباتی روزگار دکھا رہا ہے کہتا ہے عالم ہست و بود میں ہم آئے وے حباب وار چشم زدن کے واسطے ۔ آنکھ کھلی اور ختم ہو گئے ۔ اہل دل کے نزدیک اس عالم تکوین و ایجاد دنیائے فانی سے آنکھ بند ہونا عالم لافانی کی طرف کھل جانا ہے ۔ موت فی الحقیقت موت نہیں ہے بلکہ ایک خواب گراں سے آنکھ کھل جانا ہے جاگ اٹھنا ہے ۔ حباب چونکہ ابھرا ہوا ہوتا ہے گول ہوتا ہے ۔ اس وجہ سے آنکھ سے تشبیہہ دیتے ہیں بلبلے کی جب تک آنکھ بند رہتی ہے قائم رہتا ہے ۔ آنکھ کھلی اور ختم ہوا ۔ تمثیل نہایت مکمل ہے ۔

---

(۱) اعیان ہیں مظاہر ظہور تیرا ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا

(۲) ہم ہوں نہ ہوں وے ہے ہونا ضرور تیرا یاں افتقار کا تو امکاں سبب ہوا ہے

(۳) اے عقل بے حقیقت دیکھا شعور تیرا باہر شناسگی تو قید خودی سے اپنی

(۴) یاں بھی شہود تیرا واں بھی حضور تیرا ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت

(۵) جی میں سما رہا ہے از بس غرور تیرا جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یاں

اے درد منبسط ہے ہر سو کمال اس کا
نقصان گر تو دیکھے تو ہے قصور تیرا

---

(۱) ماہیت ۔ ہر وہ شے جو ہیئت رکھتی ہے یعنی عالم صورت ۔ یعنی دنیا اعیان موجودات عالم ۔

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز تیرے نور سے منور ہے ۔ تیرے جلووں کی حامل ہے تمام کائنات ۔ موجودات عالم تیری جلوہ گاہ ہے اور چشم بینا تیرے جلوے کو ہر جگہ مشاہدہ کرتی ہے

(۲) افتقار بمعنی ذلت۔ امکان بمعنی ہونا۔ یعنی کون و مکان۔

شاعر کہتا ہے کہ خدا کا وجود عالم امکان کا محتاج نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وجود انسانی عالم کے لئے باعث ننگ وعار و وجہ تذلیل ہے۔ بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ انسان کے احساس عاجزی نے ایک برتر طاقت کا ہیولے بنایا جو خدا کہلایا۔ بعض کہتے ہیں کہ معبود کے لئے عبد ضروری ہے۔ اور شانِ عبودیت کا اظہار انسان کو پیدا کئے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے اس جسدِ فانی کو عالمِ وجود میں لایا گیا۔ خواجہ میر درد ان دونوں خیالات کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہستی انسانی تو دنیا کے لئے باعثِ ننگ وعار ہے۔ وجہ تذلیل ہے۔ انسان ہو یا نہ ہو۔ خدا کا ہونا لازمی ہے۔ وہ اوّل سے ہے اور آخر تک رہے گا۔ ھوالاول ھوالآخر۔

(۳) عقل انسانی حواس انسانی کی طرح محدود ہے۔ اور اپنی بساط سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ اک دائرہ ہے جس کے اندر تگ و تاز دوڑ دھوپ کرتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ پھر اس کے لئے کیونکر ممکن ہے کہ اس ذات کو سمجھے جو تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۴) غیب۔ یعنی عالمِ غیب۔ وہ عالم جو نظروں سے اوجھل ہے۔ شہادت۔ یعنی عالمِ شہود۔ وہ عالم جس کو ہم مشاہدہ کر رہے۔ دیکھ رہے ہیں۔ مطلب اس دنیا سے ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ عالم غیب اور عالم شہود کا فرق و امتیاز غلط ہے۔ اگر دیدۂ حقیقت نگر سے دیکھو تو یہ دونوں ایک ہی نظر آئیں گے۔ اس لئے کہ ایک ہی جلوہ ہے۔ جس پر ان دونوں کا وجود ہے۔ اس دنیا میں وہ ہر گوشے پر پرتو فگن۔ جلوہ نما۔ عالم غیب میں ہر شے اس ذات کے سامنے حاضر۔

(۵) خیال ہے کہ انسان صفاتِ خداوندی کا حامل ہے۔ نیز نفخت فیہ من روحی (میں نے پھونکا اس میں اپنی روح میں سے) کے تحت ایک گروہ انسان کو اس ذات کا ایک جزو بناتا ہے۔ سوان تخیلات کے تحت جب کہ انسان میں ایک طرف تو خدا کی صفات موجود، دوسری طرف اس کا ایک جزو کہے جانے کا مستحق۔ پھر کیونکر یہ سر کسی غیر اللہ کے سامنے جھک سکتا ہے۔ اس میں تو اس ذات بلند و برتر کا کبر و غرور سمایا ہوا ہے۔

(۶) مقطع میں کمال کے معنی انتہا کے ہیں۔ نقصان کے معنی کمی کے ہیں۔ منبسط کے معنی پھیلا ہوا۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا (۱) ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا (۲) خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں (۳) آشنا اپنا بھی واں اِک سبزۂ بیگانہ تھا
ہوگیا مہماں سرائے کثرت موہوم آہ وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وہ سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہی آشنا تھا یا نہ تھا

---

(۱) دیر و حرم کعبہ و بتخانہ جہاں بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔ تیرا جلوہ نظر آیا۔ ان گھروں کا مالک تو تھا۔ دوام و قیام تیری ذات کو تھا۔ انسان کی حقیقت ایک مہمان سے زیادہ نہ تھی۔ عارضی۔ چند روزہ۔ ختم ہو جانے والی۔

(۲) جب دنیا سے کوچ کا وقت آیا۔ جب اس دار فانی کی طرف سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تو آنکھیں کھلیں اس آبلہ فریب کی حقیقت نظر آئی اور ہم

سمجھے کہ یہ سب دھوکے کی ٹٹی تھی۔ حیات بے ثبات تھی۔ قلزم ہستی کی ہستی سراب سے زیادہ نہ تھی۔ یہ عالم خواب اور افسانے سے زیادہ نہ تھا۔

(۳) سنتے ہیں کہ باغ پر باد خزاں چلی۔ گلشن تاراج ہوگیا۔ کیاریاں اُجڑ گئیں۔ افسوس وہاں سبزۂ بیگانہ ہمارا بھی آشنا تھا۔ انسان کو کسی جگہ کی بربادی کا زیادہ قلق اس وقت ہوتا ہے۔ جبکہ وہاں اس کا کوئی جاننے والا بھی ہو۔ نیز سبزۂ بیگانہ سے آشنائی میں صنعتِ تضاد بھی ہے اور یہ بھی خیال مضمر کہ گُل بوٹوں تک تو ہماری رسائی ہوئی نہیں۔ ہاں پیروں میں پڑے ہوئے سبزے سے شناسائی تھی۔

کبھو خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

چھپے ہرگز نہ مثلِ بو وہ پردوں کے چھپائے سے
(۱) مزا پڑتا ہے جس گل پیرہن کو بے حجابی کا

شرار و برق کی سی بھی نہیں یاں فرصتِ ہستی
فلک نے ہم کو سونپا کام جو کچھ تھا شتابی کا

یں اپنا دردِ دل چاہا کہوں جس پاس عالم میں
(۲) بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

کبود چرخ دیکھا تو سواری کے نہیں قابل
(۳) مہِ نو سے ہے پیدا عیب اس کی بدرکابی کا

زمانے کی نہ دیکھی جرعہ ریزی درد کچھ تو نے
ملایا مثلِ مینا خاک میں خوں ہر شرابی کا

---

(۱) شاعر پھول کی پتیوں کو پردوں سے تعبیر کر رہا ہے۔ اور خوشبو اُن میں رہتی ہے۔ تاہم سارے باغ میں ہر جگہ موجود۔ پس جس شوخ کو اپنے جلوے دکھانے کی عادت پڑ جائے وہ پردوں کے باوجود جھلک دکھاتا جاتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ شاہدِ قدرت حجابات کے باوجود تمام عالم میں مثلِ بوئے گُل جلوہ کناں ہے۔

(۲) میں جس کے روبرو داستانِ غم لے کر گیا۔ اس سے قبل کہ میں زبان کھولوں وہ اپنا صحیفۂ الم کھول بیٹھا۔ دنیا میں ہر شخص آفات کا شکار ہے۔ ایک کی دوسرا سنتا نہیں اپنی اپنی بپتا میں مبتلا ہیں۔ عنوان ہیں مختلف مگر افسانہ ایک ہے۔

(۳) پہلے مصرعے میں دعویٰ ہے۔ دوسرے میں دلیل۔ کبود گھوڑے کا ایک رنگ ہے آسمان کا بھی یہی رنگ ہے۔ اس وجہ سے کبود چرخ کہا گیا۔ نیز گھوڑے کا کام ہے چلتے رہنا اور آسمان بھی قدیم اعتقاد کے مطابق گردش میں ہے۔ کاوے کاٹ رہا ہے۔ یہ بھی وجہ شبہ ہے اب بدرکابی کو لے لیجئے۔ اس ترکیب کے یہ معنی نہیں کہ گھوڑے کی رکاب میں کوئی عیب ہے (رکاب زین کا وہ حصہ جہاں پیر رکھ کر چڑھتے ہیں اور جس میں پاؤں ٹکے رہتے ہیں) بلکہ بدرکابی لغوی معنی میں لیجئے۔ رَکِبَ معنی سوار ہونا۔ بدرکاب وہ گھوڑا جو سواری میں عیب دار ہو جو سواری کے لئے مناسب نہ ہو۔ شعر میں آگے چل کر مہ نو کو بدرکابی کی دلیل میں پیش کیا ہے اس ثبوت میں مناسبت اور وجہ شبہہ دیکھنی ہے۔ عام طور پر گھوڑے تین طرح سے چلنے والے ہوتے ہیں۔ اول جو گردن اُٹھا کر چلیں۔ یہ قسم سواری کے لئے خاص طور پر جنگ میں کار آمد ہے۔ چونکہ سوار کی حفاظت کرتا ہے۔ دوسری قسم ان گھوڑوں کی ہے جو گردن جھکا کر چلیں۔ یہ عام طور پر گاڑی میں اچھے رہتے ہیں۔ تیسری قسم گردن ٹیڑھی کر کے چلنے والوں کی ہے۔ اور یہ بدترین قسم سمجھی جاتی ہے۔ ایسا گھوڑا نہ سواری کے لئے اچھا نہ گاڑی کے لئے۔ جو گھوڑا گردن ٹیڑھی کر کے چلے گا۔ قدرتاً اس کی لگام ایک جانب جھک جائے گی۔ کج ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے آخر الذکر قسم کے گھوڑے کو کج لگام کہتے ہیں۔ اور یہ عیب شمار کیا جاتا ہے۔ مہ نو کج ہے۔ اور کبود فلک کی لگام بدیں وجہ

خنگ فلک کج لگام قرار پایا اور سواری کے لئے عیب دار۔

شاعر پہلے مصرعہ میں دعویٰ کرتا ہے کہ کبود فلک سواری کے قابل نہیں کسی کی ران کے نیچے نہیں دبا۔ کوئی شہسوار اس کو راہ پر نہ لا سکا۔ کوئی چابک دستِ چابک سوار اس کو شائستہ نہ کر سکا۔ وہ کسی کے بس میں نہ آیا۔ دوسرے مصرعہ میں دلیل دیتا ہے کہ منو دیکھ لو جو اس کی لگام ہے ہمیشہ سے کج ہے اور کوئی سیدھی نہ کر سکا۔

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا (۱) جی نہ رہے یار ہے مجھ کو ادھر دیکھنا

گرچہ وہ خورشید رو نت ہے میرے سامنے (۲) تو بھی میسر نہیں بھر کے نظر دیکھنا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

ذکر وفا کیجئے اس سے جو واقف نہ ہو کہتے ہو یہ کس سے تم ٹک تو ادھر دیکھنا

مثلِ شرر تنگ چشم ہستیٔ بے بود ہے (۳) دیکھ نہ سکتا اُسے ٹک بھی جدھر دیکھنا

نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا دردبس

جی میں یہ رہ جائے یہ آہ بھی کر دیکھنا

---

(۱) جگر دیکھنا بمعنی ہمت دیکھنا۔ جانتا ہوں کہ تیری طرف دیکھنے میں جان کا خطرہ ہے۔ یہ وہ نظارہ ہے۔ جس کی تاب حضرت موسیٰ نہ لا سکے۔ تاہم ادھر دیکھنے کی دل میں ٹھانی ہے اور دیکھ کر رہوں گا (پروانہ جانتا ہے کہ قرب شمع موت ہے تاہم جا نہار جاتا ہے پر جاتا ہے)

(۲) جلوہ خداوندی ہر لحظہ انسان کے رُوبرو ہے۔ لیکن یہ آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں جس طرح سورج ہر وقت سامنے ہے۔ لیکن اس کی طرف آنکھ بھر کر

دیکھنا ممکن نہیں۔

(۳) تنگ چشم۔ بمعنی کم فرصت۔ یہ شرر کو چشم سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ چنگاری ایک لمحہ کے لئے چمکتی ہے۔ نظر آتی ہے اور پھر نظروں سے غائب ہوجاتی ہے۔ فرصتِ حیاتِ بشر زندگیٔ شرر سے بھی کوتاہ ہے کہ نظر ہی نہیں آتی اور حقیقت ہے زندگی یا حیات بالذات نظر نہیں آتی۔

بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا (۱) اکسیر پر مہوّس اتنا نہ ناز کرنا

ہے اپنے دل سے لازم چوں غنچہ ساز کرنا (۲) کب دل ملے کسی کا ہم غم زدوں سے کھل کر

لڑکے ہو تم کہیں مت افشائے راز کرنا (۳) اے آنسوؤ نہ آئے کچھ دل کی بات منہ پر

اے امتیاز ناداں ٹک امتیاز کرنا (۴) تو اپنے ہاتھوں آپ ہی پڑتا ہی تفرقہ ہیں

ہم جانتے نہیں ہیں لے دیر کیا ہے کعبہ
جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

---

(۱) شاعر کہتا ہے کہ اے کیمیا گر تو نے مختلف چیزوں کو پگھلا کر اکسیر بنا لی تو یہ امر قابلِ نازش نہیں۔ اس سے بہت زیادہ مشکل اور کارآمد کام دل میں سوز و گداز پیدا کرنا ہے۔

(۲) ہم دل گرفتہ ہیں۔ غم زدہ ہیں۔ ہمارے دل گھٹے ہوئے ہیں۔ ایسوں سے بھلا کون انبساط کے ساتھ فراخدلی سے مل سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم بھی غنچہ کی طرح جس کا دل بند ہوتا ہے۔ اپنے دل سے خود ہی راہ و رسم بڑھائیں۔ راز و نیاز کی باتیں کریں ساز باز کریں۔

(۳) آنسوؤں کو طفلِ اشک کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی میعادِ حیات بہت

محدود ہوتی ہے۔

(۴) اگرادراک امتیاز نہ ہو۔ اگراحساسِ پستی وبلندی نہ ہو۔ اگرفہم بیش وکم نہ ہو، تو تفرقے ختم ہوجائیں۔ یہ تو شعور امتیاز ہے جو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ بلند وپست دکھاتا ہے کہ اے امتیاز یہ سب افتراق تیرے پیدا کردہ ہیں۔ تو ذرا دل میں سوچ۔ دوسرے امتیاز کے معنی سوچنے کے ہیں۔

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا — (۱) ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

یارب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے — غم رہ گیا کبھو کبھو آرام رہ گیا

ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر — لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا

سوبار سوزِ عشق نے دی آگ پر ہنوز — (۲) دل وہ کباب ہے کہ جگر خام رہ گیا

ہم کب کے چل بسے تھے پر اے مژدۂ وصال — کچھ آج آج ہوتے سرانجام رہ گیا

مدت سے وہ تپاک تو موقوف ہوگئی — (۳) اب گاہ گاہ بوسہ یہ پیغام رہ گیا

(۴) از بسکہ ہم نے حرف دوئی کا اٹھا دیا
اے دردؔ اپنے وقت میں ابہام رہ گیا

---

(۱) مہر ثبت کرنے سے اس پر سیاہی لگائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے روسیاہ کہا گیا۔ مہر خود بے ثبات ہے۔ حیات شاہ کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن جن احکامات پر لگائی جاتی ہے وہ دائم وقائم رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان جو کام کر جاتا ہے وہ رہ جاتے ہیں اور خود نہیں رہتا۔

(۲) جگر خام اس چیز کو کہتے ہیں جو اندر سے کچی رہ جائے اور یہ پختہ میں عیب گناہ جاتا ہے۔ کباب جس کے اندر تک آنچ نہ پہونچی ہو اور جو صرف اوپر

سے پک گیا ہو اور اندر سے کچا رہ گیا ہو اس کو جگر خام کہتے ہیں. شاعر کہتا ہے کہ میرا دل معیارِ عشق پر پورا نہ اترا۔ آتشِ عشق سے کباب تو ہوا و لے عیب دارہ پورا نہ پک سکا۔ پختہ نہ ہوا۔ اندر سے کچا رہ گیا۔ یعنی قلب انسانی میں جذبِ عشق بھرپور نہیں۔ آتشِ عشق لے اس کو پختہ و پختہ کار بنانا چاہا و لے یہ خام کار ہی رہا۔

(۳) بوسہ بہ پیغام۔ کسی آتے جاتے کے ہاتھ سلام دُعا کہلا بھیجنا۔ ممکن ہے اشارہ پیغمبروں کی طرف ہو۔

(۴) ایہام ایک صنعت ہے۔ جہاں معنی مبہم ہو جائیں۔ یعنی ایک سے زیادہ سمجھے جا سکیں۔ شاعر کہتا ہے کہ گو ہم نے حرفِ دوئی کا مٹا دیا۔ پر وہم دوئی دور نہ کر سکے۔ شک و شبہہ ابھی باقی ہے۔ صحیح معنی میں وحدت پرست نہ بنے۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا (۱) تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے کر دیکھا

روزِ عاشق مزاج ہے کوئی
(۲) درد کو قصہ مختصر دیکھا

(۱) ہمہ اوست

(۲) روز۔ بمعنی بہت۔ انشاء اللہ خاں کہتے ہیں۔ کہ روز دھوم سے آتا ہے ناقہ لیلے

عاشق بیدل ترا یاں تک تو جی سے سیر تھا (۱) زندگی کا اُس کو جو دم تھا دمِ شمشیر تھا

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اس کو بھی
جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

حرص کرواتی ہے روبہ بازیاں سب ورنہ یاں
اپنے اپنے بوریئے پر جو گدا تھا شیر تھا

اشک نے میرے ملائے کتنے ہی دریا کے پاٹ
(۲) دامنِ صحرا ہیں ورنہ اس قدر کب گھیر تھا

شیخ کعبہ ہو کے پہونچا ہم کنشٹ دل میں ہو
(۳) درد منزل ایک تھی ٹک راہ کا ہی پھیر تھا

---

(۱) شاعر نے لفظ "دم" سے حسنِ معنی پیدا کئے ہیں۔ دم بمعنی سانس۔ دم شمشیر تلوار کی دھار۔ کہتا ہے تیرا عاشق زندگی سے اس درجہ بیزار تھا۔ کہ اس کا ہر سانس دم شمشیر کے مترادف تھا۔ شعر میں بانکپن یہ ہے کہ سانس ایک طرف توو جہ حیات ہے۔ لیکن دوسری طرف عرصۂ زیست کو قطع بھی کر رہا ہے۔ اس نسبت سے اس کو دم شمشیر کہا گیا۔

(۲) خواجہ میر درد وسعت دامنِ صحرا کی یہ وجہ بتاتے ہیں کہ ان کے اشکوں نے بہت سے دریاؤں کے پاٹ ملا کر ایک کر دئے۔ لیکن اس طرح تو دریا کا سمندر بن جاتا۔ دامن صحرا کیوں دراز ہوا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ پہلے تو آنسوؤں نے دریا کے پاٹ ملائے۔ پھر آہ شرربار نے ان کو خشک کیا اور صحرا ہی صحرا رہ گیا۔ کوہ کندن وکاہ برآوردن۔ شعر کے معنی مبہم ہیں یا فی بطن الشاعر۔

(۳) منزلِ مقصود دونوں کی ایک ہے۔ عابد وزاہد راہِ شریعت پر چلے کعبے گئے۔ صوفیہ نے کعبۂ دل کا طواف کیا۔

کام یاں جس نے جو کہ ٹھہرایا
جب تلک ہووے آپ ہی کام آیا

بے طرح کچھ اولجھ گیا تھا دل
(۱) بیوفائی نے تیری سلجھایا

اس محبت نے جی بہت کھایا		آنسو کب تک کوئی پئے جاوے
جو ہمیں دوستی نے دکھلایا		دشمنی نے سنا نہ ہووے گا
ہم نہ کہتے تھے منہ نہ چڑھ اس کے
درد کچھ عشق کا مزہ پایا

---

(۱) دنیا میں دل بری طرح پھنس گیا تھا۔ لیکن جب دیکھا کہ یہ بیوفا کسی کا تھا نہیں دیتی تو دل اُچٹ گیا۔ ہم زمانے کے دام میں پھنس گئے تھے۔ پر جب یہ نظر آیا کہ اس کے پرستار چلے جاتے ہیں اور اس کی رونق کم نہیں ہوتی تو پھندے بھی کھل گئے اور آنکھیں بھی۔

گر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا		تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے		مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا
گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں		میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا
جفا سے غرض امتحان وفا ہے		تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا
قفس میں کوئی تم سے اے ہمصفیر		خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا
خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

جی میں ہے سیرِ عدم کیجئے گا		یک بیک خلق سے رم کیجئے گا
مورد قہر تو یاں ہم ہی ہیں		اور کس پر یہ کرم کیجئے گا
سخت بیباک ہے یہ خامۂ شوق (۱)		اپنے ہاتھوں کو قلم کیجئے گا

ٹک بھی گردوں نے اگر فرصت دی (۲) عیش کو کشتۂ غم کیجئے گا
گرمیِ اشک سے مانندِ شراب آب و آتش کو بہم کیجئے گا
سینہ و دل کے تپش داغوں سے رشکِ گلزارِ ارم کیجئے گا
قصد ہے قطع بطورِ مستاں (۳) عرصۂ دیر و حرم کیجئے گا
پھر جب آوے گی جی میں جوں برق ق راہ طے اک دو قدم کیجئے گا

شدتِ مہرِ بتاں دل سے آہ
دردؔ کس طرح سے کم کیجئے گا

---

(۱) ہاتھ قلم کرنا، یعنی ہاتھ کاٹنا۔

(۲) ہم اس درجہ عیش دشمن و آلام دوست ہیں کہ اگر فلک ذرا بھی مہلت دے تو زمانے بھر کے عیش کو شکارِ غم کر دیں۔ آج جو دنیا میں قدرے آرام و آسائش کی جھلک نظر آتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہم کو آسمان نے گھیر رکھا ہے۔

۳ و ۴ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ خواجہ میر درد دریافت کرتے ہیں کہ مستانہ وار بادۂ عرفان سے سرشار جھومتے ہوئے از خود رفتہ برق کی مانند دیر و حرم کے جھمیلوں سے گذر جائے گا۔

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما اس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
کیوں بھنویں تانتے ہو بندہ نواز (۱) سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم　　نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

آپ سے ہم گذر گئے کب کے　(۲)　کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کونسا دل ہے وہ کہ جس میں آہ　(۳)　خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

تجھ سے ظالم کے سامنے آیا　　جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد

بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

---

(۱) بھویں تاننا۔ بمعنی ناراض ہونا۔ چونکہ ابرو کو شمشیر سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے شاعر لفظ سپر لایا ہے۔ صنعت مراعات النظیر۔

(۲) گو ہم ظاہرا اس عالم صورت میں موجود نظر آتے ہیں۔ یعنی ابھی تک دنیا میں موجود ہیں زندہ ہیں۔ لیکن فی الحقیقت منزلِ خودی سے گذر چکے ہیں۔ سرمستِ عشق خدا ہیں۔ فنا فی اللہ ہیں۔

(۳) خانہ آباد بمعنی خانہ برباد طنزیہ انداز بیان ہے۔ شاعر کہتا ہے ایسا کونسا دل ہے جس میں خانہ بر انداز تو نے گھر نہ بنایا ٹھکانا نہ بنایا جہاں تو جاگزیں نہ ہوا۔ نیز یہ سب خطاب آہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی روئے سخن آہ کی طرف بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا　(۱)　پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلہ کے حضور　(۲)　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن　　میں جو پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے　　وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا (۴) کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور تھا

محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

---

(۱) ایک حد تک اس کے ہم معنی شعر حافظ کے ہاں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔
رسم عاشق کشی و شیوۂ شہر آشوبی جامۂ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود
(۲) حضور بمعنی مقابل۔ تجلیاتِ دنیوی نورِ حقیقت کے سامنے بے نور تھیں۔
(۳) گو انسان بال و پر سے محروم تھا۔ تاہم وہاں پہونچا یعنی وہ مرتبہ حاصل کیا۔ وہ قربِ خدا پایا جس سے پر پرواز رکھنے والی مخلوق یعنی فرشتہ اور جن بھی محروم تھے۔ اشارہ ہے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی جانب۔ خلیفۃ اللہ اور نفخت فیہ من روحی کی طرف نیز معراج بھی مد نظر ہے۔ (صنعتِ تلمیح)
(۴) زخم ایک عرصے تک رہے تو ناسور بن جاتا ہے۔

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

اُس نے قصداً بھی میرے نالے کو نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا

دیکھئے غم سے اب کے جی میرا نہ بچے گا بچے گا کیا ہوگا

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

حال مجھ غم زدے کا جس تس نے جب سُنا ہوگا رو دیا ہوگا

دل کے پھر زخم تازے ہوتے ہیں (۱) کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

یک بیک نام لے اُٹھا میرا — جی میں کیا اس کے آگیا ہوگا

میرے نالوں پہ کوئی دُنیا میں — بن کئے آہ کم رہا ہوگا

قتل سے میرے وہ جو باز رہا — کسی بدخواہ نے کہا ہوگا

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا

(۲) آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

---

(۱) دل کے زخم پھر سے ہرے ہوئے۔ کہیں غنچہ چٹکا، مطلب یہ کہ بہار آئی۔ غنچے کا کھلنا اور بہار کا آنا مترادف ہیں۔

(۲) دل کی حقیقت اس کی کل کائنات ایک قطرۂ خون سے زیادہ نہیں۔ اب اس کو جہاں تہاں ناحق تلاش کرتے ہو۔ کہیں آنسوؤں میں مل کر ٹپک گیا ہوگا۔

تو اپنے دل سے غیر کی اُلفت نہ کھو سکا — میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

رکھتا ہوں ایسے طالع بیدار میں کہ رات — (۱) ہمسایہ میرے نالوں کی دولت نہ سو سکا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر — میں نے تو درگذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

دشتِ عدم میں جا کے نکالوں گا جی کا غم — (۲) کُنجِ جہاں میں کھول کے دل میں نہ رو سکا

جوں شمع روتے روتے ہی گذری تمام رات

توبھی تو دردؔ داغ جگر میں نہ دھو سکا

---

(۱) طالعِ بیدار۔ بختِ خوابیدہ کی جگہ طنزاً لایا ہے۔ طالعِ بیدار اور ہمسائے کا نہ سونا یک جا آنا حسنِ کلام ہے۔ دولت بمعنی بدولت۔ شاعر کہتا

ہے کہ کیا عجیب قسمت لے کر پیدا ہوا ہوں کہ نہ صرف میں ہی اُس کے ہاتھوں آفت میں ہوں اور تمام رات صرفِ آہ و بُکا رہتا ہوں۔ بلکہ اہلِ محلہ بھی تنگ ہیں اور اُن کی بھی نیندیں اُڑ جاتی ہیں۔ راتیں آنکھوں میں کٹتی ہیں۔

(۲) کم وسعتیٔ روزگار کی وجہ سے دل کھول کر نہ رو سکا۔ اس عالم محدود میں میرا نالہ بھی پابند حدود رہا۔ اب عدم یعنی عالم لامحدود میں دل کی دل بھر کے نکالوں گا۔ مدعا یہ کہ یہاں بھی روتا رہا، وہاں بھی فغاں کرتا رہوں گا۔

(۳) شمع کی بتی لو کی جگہ سے سوختہ اور سیاہ ہو جاتی ہے۔ شاعر اس سیاہی کو شمع کے جگر کا داغ بتاتا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ باوجود تمام شب گریۂ وزاری کرنے کے شمع اپنے جگر کا داغ یعنی اس سیاہی کو نہ دھو سکی۔ اسی طرح آنسوؤں سے ہمارے دل و جگر کا داغ دور نہ ہوا۔

اندازوہ ہی سمجھے مرے دل کی آہ کا — زخمی جو ہو چکا ہو کسی کی نگاہ کا

(۱) زاہد کو ہم نے دیکھ لیا جوں نگیں بہ عکس — روشن ہوا ہے نام تو اس روسیاہ کا

ہر چند فسق میں تو ہزاروں ہیں لذتیں — لیکن عجب مزا ہے فقط دل کی چاہ کا

(۲) لے کر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے — گر درمیاں حساب نہ ہو سال و ماہ کا

رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری اِدھر — یارب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا

دل اُس مژہ سے رکھیو نہ تو چشم آشتی — اے بے خبر بُرا ہے یہ فرقہ سپاہ کا

شاہ گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں — نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا

سو بار دیکھی میں نے تری بیوفائیاں — تس پر بھی نت غرور ہے دل میں نباہ کا

لے درد چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذب عشق
(۴) کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگ گاہ کا

(۱) زاہد پاک باز کو ہم نے پرکھ لیا۔ دیکھ لیا، سمجھ لیا۔ دنیا میں جو اُس کا نام روشن ہوا ہے وہ غلط طریقوں نیز کج فہمی و کج راہی کی وجہ سے ہے نگیں یعنی مہر جب کسی چیز پر لگائی جاتی ہے تو اُلٹ کر لگاتے ہیں۔ علاوہ ازیں حروف جو کندہ ہوتے ہیں وہ بھی اُلٹے ہوتے ہیں۔ مزید برآں چاروں طرف سیاہی لگنے کے بعد نام اُبھرتا ہے۔ شاعر کا مدعا ہے کہ مولوی و مُلّا غلط طریقوں سے روشناس ہوئے۔ اور انھوں نے گرد و پیش کو سیاہ کر کے اپنا نام روشن کیا۔

(۲) ازل اور ابد۔ عالمِ لا محدود کے دو سرے ہیں۔ ازل، اول کا حصہ۔ ابد، آخر کا۔ ان دونوں کے درمیان برزخ، دُنیا ہے۔ یعنی عالمِ ماہ و سال۔ زمانہ محدود۔ شاعر کہتا ہے کہ درحقیقت ازل اور ابد میں بُعد نہیں ہے۔ یہ دوری توہم کو اس وجہ سے معلوم ہوتی ہے۔ کہ ان کے درمیان عرصۂ حیات آ گیا ہے۔ جو پابند زمان و مکان ہے۔ اور ہم وقت کو ماہ و سال کے پیمانے سے ناپنے لگے۔ ورنہ اگر ہم معیارِ لا محدود سے اس عالمِ محدود کا حساب لگائیں تو یہ سارا زمانہ ایک آن سے زیادہ نہیں۔

(۳) غرور۔ بمعنی دھوکہ۔

(۴) کہربا گھاس کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ گھاس مجبوراً کھچی چلی جاتی ہے اسی طرح میری خلقت میں ہے کہ عشق کی جانب کھنچ جاؤں اور مجبوراً چلا جا رہا ہوں۔

(۱۸)

دل کس کی چشمِ مست کا سرشار ہو گیا — کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا
کچھ ہے خبر تجھے بھی کہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو — عاشق تری گلی میں کئی بار ہو گیا

بیٹھا تھا خضر آکے مرے پاس ایک دم (۱) گھبرا کے اپنی زیست سے بیزار ہو گیا
چاکِ جگر تو سیکڑوں خاطر میں کچھ نہ تھے (۲) دل کی تپش کے آگے میں ناچار ہو گیا
کھٹکے کبھو دلوں میں نہ تیری صدا جرس (۳) نالہ مرا تو چھوٹتے ہی پار ہو گیا
اے درد ہم سے یار ہے اب تو سلوک میں
خط زخم دل کو مرہم زنگار ہو گیا

---

(۱) حضرت خضر جو ہمیشہ سے مصائب و آلام دیکھتے چلے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر کو میرے پاس آن بیٹھے تھے تو اُن کو بھی زندگی دوبھر ہو گئی، شاعر اپنی انتہائے الم زدگی دکھا رہا ہے۔

(۲) خاطر میں نہ ہونا۔ یا خاطر میں نہ لانا۔ بمعنی پروانہ کرنا۔ کوئی حقیقت نہ سمجھنا حقیر جاننا

(۳) اس شعر میں "جرس" شاید دو معنی دے رہا ہے۔ ایک تو وہ جرس جو کارواں سے متعلق ہوتا ہے اور شعرا کے تخیل کے تحت مفارقتِ منزل پر فریاد کرتا جاتا ہے لیکن اگر اس شعر میں لفظِ جرس سے سانس کو تعبیر کیا جائے تو بہت خوشنما معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میری آہ و فغاں تو دلوں میں چبھ گئی اے سانس کہیں تو بھی بارِ خاطر نہ ہو جائے۔ دلوں میں نہ کھٹکنے لگے۔ یعنی میری زندگی لوگوں پر گراں نہ گذرنے لگے۔

(۴) مرہم زنگار۔ نیلے تھوتھے کا مرہم۔ جب شروع شروع ڈاڑھی نکلتی ہے تو گورے گورے رخساروں پر کچھ سبزی۔ کچھ نیلاہٹ جھلک مارتی ہے۔ اسی مناسبت سے سبزہ خط کہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جب سے میرے محبوب کا سبزہ خط آغاز ہوا ہے وہ میری طرف ملتفت ہو گیا ہے اور

میرے زخمِ دل مندمل ہو گئے۔ نیلے تھوتھے کا رنگ بھی قدرے سبزی لئے ہوئے ہوتا ہے اس لئے سبزۂ خط کو اس سے تعبیر کیا ہے۔

ہم نے ہی اس جہان سے آخر سفر کیا ۔۔۔ تم نے تو ایک دن بھی نہ ادھر گذر کیا

(۱) اے شیخ ان بتوں نے مرے دل میں گھر کیا ۔۔۔ جن کے سبب سے دیر کو تو نے کیا خراب

اے نالہ واہ خوب ہی تو نے اثر کیا ۔۔۔ تیرے سبب سے اور بھی مجھ پر غضب ہوا

(۳) شرمندہ تیرے آگے ہیں اے شرر کیا ۔۔۔ کم فرصتی نے ہستیٔ بے اعتبار کے

(۴) سینے سے تب خدنگ نے تیرے گذر کیا ۔۔۔ پیکان و دل کے ساتھ ہوا جب معاوضہ

روتا ہوں گرمجوشیٔ مے یاد کر کے درد
آتش نے مجھ کو شمع کے مانند تر کیا

---

(۱) دیدارِ خدا سے دنیا میں محروم رہے۔ آخر کار اس مہجور روزگار سے رختِ سفر باندھ لیا۔

(۲) اس شعر میں بتوں سے مراد خواہشاتِ دنیا ہے۔ عام طور پر خواہشات کے مجسمہ بنا کر پرستش کی جاتی ہے۔

(۳) ہماری زندگی تنگ فرصت چشمکِ شرر سے بھی کم ہے۔ نیز اگر شرر سے مراد شررِ عشق خداوندی ہے۔ جو قلبِ انسانی کو ودیعت کیا گیا ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کم تھی اس وجہ سے ہم اس شرر کے حق سے عہدہ بر آنہ ہو سکے اگر فرصتِ حیات زیادہ ہوتی تو ہم اس شرر کو روشن کرتے اور آگ بنا دیتے۔

(۴) دل میں تیرا تیر آن بیٹھا تھا۔ اور اس وقت گیا جب کہ دل کا پیکان

سے تبادلہ کیا۔ مطلب یہ کہ تیرِ خدنگ جب سے دل میں لگا ہے دل نہ رہا اس کی جگہ پیکان رہ گیا۔

شب گذری اور آفتاب نکلا (۱) تو گھر سے بھلا شتاب نکلا
اے آتشِ عشق جس کو ہم یاں دل سمجھے تھے سو کباب نکلا
ایدھر کو جو مسکرا کے دیکھا کچھ تو جیسے حجاب نکلا
ہر چند کئے ہزار نالے پر دل سے نہ اضطراب نکلا

میخانۂ عشق میں تو اے درد
تجھ سا نہ کوئی خراب نکلا (۲)

---

(۱) بادی النظر میں اس شعر کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ عاشق معشوق سے شکایت کر رہا ہے کہ رات گذر گئی دن نکل آیا۔ تب کہیں جناب گھر سے برآمد ہوئے ہیں۔ حقیقت میں شاعر کا مدعا یہ ہے کہ شباب بیت گیا۔ کہولت آگئی۔ اب تو خانۂ عیش سے باہر آ۔ شب سے مراد شباب کہ سر سیاہ ہوتا ہے۔ نیز سیہ مستی کا زمانہ ہوتا ہے۔ آفتاب سفید بالوں کے مترادف ہے۔ اور گھر سے مراد تن آسانی و عیش پرستی ہے۔

(۱) خراب بمعنی۔ خراب حال۔ مست۔ فارسی میں آیا ہے۔ خراب بادۂ سرجوش کردۂ مارا۔

مانند فلک دل متوطن ہے سفر کا (۱) معلوم نہیں اس کا ارادہ ہے کدھر کا
جوں چاہیئے اس طرح بیاں ہم سے نہو گا کر اپنے دہن سے ہی تو وصف اپنی کمر کا

آزاد کسی کی بھی اُٹھاتے نہیں منت | دیکھا نہ کسی سرو کو تہ بارِ ثمر کا
بے خونِ جگر داغ تو مرجھا ہی چلے تھے | ہوتا نہ اگر چشمہ میرے دیدۂ تر کا

کہسار میں ہر سنگ یہ کہتا ہے پکار
اے درد مقر ہوں ترے نالوں کے اثر کا

---

(۱) آسمان سدا گردش میں ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے سفر کو وطن قرار دے لیا ہے۔ چونکہ وہ سفر میں رہتا ہے اور انسان جہاں رہے وہی اس کا وطن بعینہٖ میرا دل بھی ہمیشہ ڈانوا ڈول رہتا ہے۔ واللہ اعلم اس قرار دشمن و سفر دوست نے کس منزل پر اپنی نظریں جما رکھی ہیں اور کہاں کہاں کی ٹھانی ہے۔

ٹھہر جا ٹک بات کی بات اے صبا | کوئی دم کو ہم بھی ہوتے ہیں ہوا
لے نہ جاوے حرص اہلِ فقر کو (۱) | یہ سکے کب موج نقشِ بوریا
رات جب پہنچا میں اُس کے روبرو (۲) | جوں زبانِ شمع گم تھا مدعا
کھل گیا جو کچھ کہ تھا اے نیستی (۳) | ہستیٔ موہوم کا یاں افترا

درد میری تیرہ بختی کے تئیں
(۴) ڈھونڈھیو ہمسایۂ ظل ہما

---

(۱) حرص۔ ہوا و ہوس۔ خواہشات دُنیا کی بادِ تند و تیز اہل فقر کے پائے ثبات کو لغزش نہیں دے سکتی۔ بوریے کا نشان گو لہروں سے مشابہ ہوتا ہے۔ لیکن اپنے مقام پر قائم۔ پس جو بوریہ نشین ہیں وہ سیم و زر

کے سیلاب میں بہائے نہیں جا سکتے۔

(۲) عاشق جب معشوق کے سامنے جاتا۔ تو محو حیرت ہو کر رہ جاتا ہے زبان بند ہو جاتی ہے۔ دل کی کہہ نہیں سکتا۔ کسی نے کہا ہے۔

وہ آتا تو یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا ۔۔۔ سب کہنے کی باتیں تھیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

شاعر کہتا ہے کہ جب میں اپنے محبوب کے رُو برو گیا تو شمع کی مانند گو زبان تو رکھتا تھا وے طاقتِ گویائی نہ تھی۔ شمع باوجود زبان رکھنے کے بولنے سے معذور ہے۔ عرفی کہتا ہے

در آتش آمدیم و فغانے نداشتیم ۔۔۔ بودیم شمع شوق و زبانے نداشتیم

(۳) ہستیٔ بے ثبات نے جو ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ نیستی سے دوچار ہونے پر اُٹھ گیا۔ جب نیستی سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ ہستی ناپائدار تھی۔ اس کی حقیقت کھل گئی۔

(۴) امیر کے پڑوس میں امیر ہی رہے گا۔ بڑے کے ہمسائے میں بڑا ہی آن کے بسے گا۔ شاہ کے زیرِ دیوار وزیر ہی کا محل ہو سکتا ہے۔ ہم پلہ و ہم مرتبہ ہی ایک دوسرے کے قریب رہتے بستے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر میری کم نصیبی کو ڈھونڈھنا ہو تو ہما کے ہمسایہ میں جا کر تلاش کرنا۔ مدعا یہ کہ خوش بختی میں جو منزلت ہما کو نصیب ہے بدبختی میں وہی مرتبت میرے طالعِ خوابیدہ کو حاصل ہے۔

کھلا دروازہ میرے دل پہ ازبس اوزِ عالم کا ۔۔۔ نہ اندیشہ ہے شادی کا مجھے نے فکر ہی غم کا

بلند و پست سب ہموار ہیں یاں اپنی نظروں میں ۔۔۔ (۱) برابر ساز میں ہوتا ہی جوں سُر زیر اور بم کا

گلستانِ جہاں کا دید کیجو چشمِ عبرت سے ۔۔۔ (۲) کہ ہر ایک سرو قد ہے اس چمن میں نخل ماتم کا

چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی یہ بلبل (۳) گلوں کے منہ پہ یوں چڑھتی ہی دیدہ دیکھ شبنم کا
نہیں مذکورِ شاہاں در دہر گز اپنی مجلس میں
کبھی کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادہم کا

---

(۱) ہلکے اور بھاری سروں کو زیر و بم کہتے ہیں۔ ستار۔ سارنگی۔ ہارمونیم وغیرہ میں ہوتے ہیں۔ آوازیں بلند و پست دیتے ہیں۔ لیکن ایک سُر پر قائم رکھے جاتے ہیں۔ شاعر دنیا کی پستی و بلندی کو زیر و بم سے مشابہ کر کے ہمواری ثابت کرتا ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ سب ایک مقام پر ہیں۔

(۲) نخل ماتم۔ دستور تھا کہ غمی کے گھر میں ایک درخت سا بنا کر کھڑا کر دیتے اور اس پر سیاہ دھجیاں باندھتے تھے نیز تابوت کے ساتھ بھی لے جاتے تھے۔ اُسے نخلِ ماتم کہا جاتا تھا۔ شاعر کہتا ہے دنیا کی ہر شے فنا در آغوش ہے ذرا چشم عبرت سے دیکھ تجھے نظر آئے گا کہ ہر سرو قامت جوان رعنا کے ساتھ زوالِ مرگ سایے کی طرح لگی چلی آ رہی ہے۔

(۳) منہ چڑھنا محاورہ ہے۔ گستاخی کرنا۔ دیدہ دیکھ یہ بھی محاورہ ہے۔ ہمت دیکھ کے معنی دیتا ہے۔

(۴) سوال یہ ہے کہ ابراہیم ادہم کا ذکر کیوں آیا۔ وہ کیوں مستثنےٰ کئے گئے۔ وجہ یہ ہے کہ انھوں نے شاہی ترک کر کے گدائی لے لی تھی۔ صنعتِ تلمیح

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا
تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا (۱) پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری (۲) جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

میں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھپ سے پا گیا
پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا
مٹ گئی تھی اُس کے جی سے تو جھجک
درد کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

---

(۱) شاعر دُنیا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب ہم نے تیرے اعمال دیکھے تو سوائے بیوفائی کے کہیں وفا کا پتہ نہ پایا۔ یعنی تو نے کسی کا ساتھ نہ دیا۔ تو رہ گئی اور تیرے پرستار یکے بعد دیگرے جاتے رہے۔ یہ دیکھ کر بھی ہم تیرے دلدادہ ہیں۔ آخر وہ تیری کونسی ادا ہے جو ہم کو تجھ سے برداشتہ خاطر نہیں ہونے دیتی۔ ضمناً شاعر پرتوِ ایزدی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ دُنیا میں اُس کا جلوہ نظر آرہا ہے اس وجہ سے طبیعت نفور نہیں ہوتی بلکہ راغب رہتی ہے۔

(۲) ہر غنودگی کے بعد آنکھ کھل جاتی ہے۔ ہر نیند کے بعد آدمی جاگتا ہے۔ آنکھ اگر نہیں کھل سکتی تو بعدِ مرگ۔ شاعر کہتا ہے کہ اب میری آنکھ ایسی بند ہوئی ہے کہ کھل نہیں سکے گی۔ یعنی میں مر رہا ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ موت آنکھیں نہیں بند کر رہی ہے بلکہ تصور جاناں آنکھوں میں ہے۔ اور میں اس میں اس درجہ محو ہوں کہ ہستی محو ہوئی جا رہی ہے۔ دوسرے معنے صاف یہ ہو سکتے ہیں کہ تصور جاناں کئے بیٹھا ہوں اب میری آنکھیں کھولی نہیں جا سکتیں۔

دنیا میں کون کون نہ یکبار ہو گیا
پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے جو گیا

پھرتی ہے میری خاک صبا دربدر لئے (۱) اے چشم اشکبار یہ کیا تجھ کو ہو گیا

آگاہ اس جہاں سے نہیں غیر بیخوداں جاگا وہی اُدھر سے جو موند آنکھ سو گیا

طوفانِ نوح نے تو ڈوبائی زمیں فقط (۲) میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا

برہم کہیں نہ ہو گل و بلبل کی آشتی ڈرتا ہوں آج باغ میں وہ تندخو ہو گیا

واعظ کسے ڈراوے ہے یوم الحساب سے گریہ مرا تو نامۂ اعمال دھو گیا

پھولے گی اس زمان میں گلزارِ معرفت یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

آیا نہ اعتدال پر ہرگز مزاجِ دہر میں گرچہ گرم و سردِ زمانہ سمو گیا

اے دردؔ جس کی آنکھ کھلی اس جہان میں
(۳) شبنم کی طرح جان کو وہ اپنی رو گیا

---

(۱) چشم اشکبار آنسو برسائے گی تو خاک دب جائے گی اور پھر صبا اس کو دربدر نہیں لے جائے گی

(۲) دوسرے مصرعہ میں ڈبوئے کے معنی۔ عزت ڈبونا۔ آبرو کھو دینا۔ نام ڈبو دینا ہیں۔

(۳) شبنم کی آنکھ کھلنا یعنی قطرے کی شکل میں نمودار ہونا۔ اس کے لئے پیغام اجل ہے۔ مدعا یہ کہ جس پر رازِ حیات دو روزہ کھل گیا۔ اس کی نظروں میں زندگی موت کے ہم معنی ہو گئی۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ کہ جس کو کسی نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت مصیبت ملامت بلائیں — ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجکو داغوں نے سروِ چراغاں — کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے — ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا
حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم (۱) — کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا
شب و روز اے درد درپے ہوں اُسکے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

---

(۱) خدا اور انسان کے درمیان اُس کی اپنی خودی کا پردہ حائل ہے۔ جب یہ ہستی جو پابندِ سلاسلِ خاکی ہے نہ رہی تو ہم معشوقِ حقیقی سے ہم کنار تھے۔ خودی کو مٹانے سے خدا ملتا ہے۔

نشہ کیا جانے وہ کہنے کو مے آشام ہے شیشا — (۱) جہاں میں دخترِ رز سے عبث بدنام ہے شیشا
صراحی و کدو تک خلق اے ساقی بھرے مے سے — مگر اپنا ہی خالی جوں دلِ ناکام ہے شیشا
شب و روز اس طرح گذرے ہے اپنی تو نہ پوچھو کچھ — صراحی صبح کو گر ہاتھ ہے تو شام ہے شیشا
نگاہِ مست ان آنکھوں کی ٹک ٹک بدھر بھی ہو ساقی — (۲) کہ ہم کم حوصلوں کے حق میں ہر اک جام ہے شیشا
نہ ہو گل گل شگفتہ کیونکہ دل اے درد مستوں کا
(۳) مئے گلگوں کی دولت سر بسر گلفام ہے شیشا

---

(۱) کہنے کو، اُردو کا محاورہ ہے۔ معنی ہیں بلا وجہ۔ خواہ مخواہ۔ کسی سے بدنام ہونا۔ زبان میں کسی سے تعلق رکھنے کی بنا پر بدنام ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ تعلقات سے مراد تعلقات مرد و زن ہیں۔ مثلاً فلاں عورت فلاں مرد

سے بدنام ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ شیشہ نشہ سے واقف بھی نہیں۔ بیچارہ دختِ رز کی صحبت سے بلا وجہ بدنام ہے۔

(۲) ہم تو اس قدر کم حوصلہ ہیں۔ ہم سمائی اتنی کم ہے کہ صرف جام کو دیکھ لینا وجہ خمار ہو جاتا ہے۔ ساقی ہم شراب کے طالب نہیں۔ صرف چشمِ مست سے ہماری جانب دیکھ لے۔ وہ جام میں ملتی ہیں ان کو دیکھ کر ہی ہم سرشار ہو جائیں گے۔

(۳) گل بگل شگفتہ۔ یعنی بہت شگفتہ۔ دولت بمعنی بدولت۔

تو ہن کہے گھر سے کل گیا تھا — اپنا بھی تو جی نکل گیا تھا
اب دل کو سنبھالنا ہے مشکل — اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا
آنسو مرے جو انھوں نے پونچھے (۱) — کل دیکھ رقیب جل گیا تھا
پھر ہونے لگا یہ دل تو بے چین — کتنے روزوں بہل گیا تھا
بارے پھر مہرباں ہوا ہے — بے طرح سے کچھ بچل گیا تھا
شب تک جو ہوا تھا وہ ملایم — اپنا بھی تو جی پگھل گیا تھا

میں سامنے سے جو مسکرایا
ہونٹھ اس کا بھی درد مل گیا تھا

---

(۱) آنسو پونچھنا۔ اشک شوئی کرنا۔ قدرے دلجوئی و دلدہی کرنا۔

یونہی ٹھہری کہ ابھی جایئے گا — پھر شتابی تو بھلا آیئے گا
جی کی جی ہی میں نہ رکھ جایئے گا — بات جو ہو گی سو فرمایئے گا

رُخ ہمارا بھی اگر پایئے گا — تو ہی منہ اپنا بھی دکھلایئے گا
میں جو پوچھا کبھو آؤ گے کہا (۲) — جی میں آجائے گا تو آیئے گا
کیونکہ گذرے گی بھلا دیکھوں میں — گر اسی طرح سے شرمایئے گا
میں خدا جانے یہ کیا دیکھوں ہوں (۳) — آپ کچھ جی میں نہ بھر آیئے گا
میرے ہونے سے عبث رُکتے ہو — پھر اکیلے بھی تو گھبرایئے گا
پوچھ کر حال تو پھر سنتے نہیں — بس مجھے اور نہ بکوایئے گا
کہیں ہم کو بھی بھلا کوچوں میں (۴) — پھرتے چلتے نظر آجایئے گا
زلف میں دل کو تو الجھاتے ہو — پھر اُسے آپ ہی سلجھایئے گا
خدمت اوروں ہی کو فرماتے ہو — کبھو بندہ کو بھی فرمایئے گا
قتل تو کرتے ہو مجھ کو لیکن — بہت سا آپ ہی پچھتایئے گا
حرم و دیر تو ہم چھان چکے — کہیں اُس کا بھی نشاں پایئے گا

دردؔ ہم اس کو تو سمجھائیں گے پر
اپنے تئیں آپ بھی سمجھایئے گا

---

(۱) خدا خود نہیں ملتا۔ انسان کو طلب و تلاش کرنی پڑتی ہے۔
(۲) میں نے پوچھا کبھی آئیں گے۔ جواب ملا۔ آپ کی خوشی ہو تو خود چلے آیئے گا۔ مطلب یہ کہ ہم نہیں آئیں گے۔
(۳) ہستی انسانی جلوہ ایزدی کے لئے حجابات کا بھی باعث ہے۔ نیز ذریعۂ عبودیت بھی۔
(۴) کوچوں کے معنی گلیوں کے ہیں۔ لیکن اس شعر میں مناظر دنیا سے مراد ہے۔ شاعر پوچھتا ہے کہ آیا ہم کو دیدار خدا دنیا میں نصیب ہو سکتا ہے۔

بظاہر کہیں غنچہ دل سے ملا تھا
کل اُس کا گریبان و دست صبا تھا
تمنا مرخص ہوئی نا اُمیدی (۱)
یہ کیا ہو گیا اور مرے دل میں کیا تھا
جو اس طرح غیروں سے ملتا پھرے ہے
کبھی تو ہمارا ابھی وہ آشنا تھا
کہا میں مرا حال تم تک بھی پہونچا (۲)
کہا تب اچنبھا سا کچھ میں سنا تھا
برائی تیری کچھ نہیں بات کیا ہے
مرا دل ہی یہ میرے حق میں بُرا تھا
تم اگر جو پہلے ہی مجھ سے ملے تھے
نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا
بلائیں جو کچھ اس کے ملنے سے دیکھیں
نہ ملتے تو اے درد اس سے بھلا تھا

---

(۱) مرخص۔ معنی رخصت ہونا
(۲) اچنبھا۔ معنی تعجب۔

اپنا تو نہیں یار میں کچھ یار ہوں تیرا (۱)
تو جس کی طرف ہوئے طرفدار ہوں تیرا
کڑھنے پہ مرے جی نہ کڑھا تیری بلا سے
اپنا تو نہیں غم مجھے غمخوار ہوں تیرا
تو چاہے نہ چاہے مجھے کچھ کام نہیں ہے
آزاد ہوں اس سے گرفتار ہوں تیرا
تو ہووے جہاں مجھ کو بھی ہونا وہیں لازم (۲)
تو گل ہے مری جان تو میں خار ہوں تیرا
ہے عشق سے میرے ہی ترے حسن کا شہرہ (۳)
میں کچھ نہیں پر گرمیٔ بازار ہوں تیرا
میری بھی طرف تو کبھی آ جا میرے یوسف
بوڑھیا کی طرح میں بھی خریدار ہوں تیرا
اے درد مجھے کچھ نہیں اب اور تو آزار
اس چشم سے کہہ دینا کہ بیمار ہوں تیرا

---

(۱) اے دوست میں اپنی ذات کا دوست نہیں ہیں تو تیرا دوست دار ہوں تو جس کا طرفدار ہو میں بھی اسی کی ہی حمایت کرتا ہوں۔ مدعا یہ کہ مومن کی دوستی دشمنی اللہ کی راہ میں ہے۔ جو اس کا دوست ہے اُس کے ہم دوست جو اُس کا دشمن خواہ ہمارا سگا کیوں نہ ہو۔ ہم اس کے دشمن۔

(۲) عبد و معبود میں دوری نہیں ہو سکتی۔ خالق و مخلوق کی یکجائی لازم۔

(۳) انسان بذات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہاں خدا کے خدا ہونے معبود کے معبود ہونے کی دلیل ہے۔

ایسا بھی کبھو ہوگا کہ پھر آن ملے گا — تو کب تئیں مجھ ساتھ مری جان ملے گا
(۱) گوشہ نہ ملے گا کوئی میدان ملے گا — چلئے کہیں اُس جا پہ کہ ہم تم ہوں اکیلے
(۲) کچھ بات کہیں گے جو کوئی کان ملے گا — شیوہ نہیں اپنا تو عبث ہرزہ یہ بکنا
کافر جو ترے ساتھ مسلمان ملے گا — رو بیٹھے گا میری ہی طرح دین کو اپنے
(۳) مل جائے گا تو دور سے پہچان ملے گا — نزدیک ہے پر اپنے بلا بھیجے کب آوے
تسکین تبھی ہووے گی جس آن ملے گا — یوں وعدے ترے دل کی تسلی نہیں کرتے

اے دردؔ کہا میں نے ملو جس سے کہ چاہو
(۴) کہنے لگا تجھ سا کوئی انسان ملے گا

---

(۱) اس شعر میں ذرا سا یہ پہلو ہے کہ عاشق کنج عافیت کا طالب نہیں۔ تیرا طالب ہے تو جہاں بھی ملے وہیں راضی ہے۔ مطلب یہ بوقت عبادت و ریاضت اوہام دنیوی سے آزاد ہوں۔ یک سوئی حاصل ہو۔

(۲) ہم گوش نصیحت نیوش کے سامنے بات کہنے کے عادی ہیں۔ ہر کس و

ناکس کے روبرو زبان کشائی نہیں کرتے۔ کان ملے گا۔ یعنی ہماری بات سننے کے قابل کان ملے گا۔

(۳) معشوق یا محبوب ہمیں بھولا نہیں ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بلائے سے نہیں آتا۔ اپنے من کا راجہ ہے۔ ہاں اگر کہیں ہم نظر پڑ جائیں گے تو اس درجہ دوستدار ہے کہ خود آن کر ملے گا۔

(۴) اس شعر میں دو معنی ہوتے ہیں۔ شاعر معشوق سے کہتا ہے کہ جس سے تمہاری خوشی ہو ملو۔ وہ جواب دیتا ہے کہ ہاں ملیں گے بشرطیکہ تجھ جیسا انسان ملے۔ یعنی خوبیوں والا دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب عاشق نے معشوق سے کہا کہ میرا تم پر کوئی قدغن نہیں جس سے چاہو راہ و رسم رکھو، خلا ملا کرو۔ تو اس نے جواب دیا کہ بھلا کوئی تجھ سا بھلا آدمی مل سکتا ہے جو اس درجہ فراخ حوصلگی سے کام لے اور رواداری برتے۔

سحر ہوتے ہی اُٹھ کر وہ جو گھر سے باہر نکلا (۱) اُدھر ہی اتفاقاً پھرتے پھرتے میں بھی جا نکلا
مرے دل کو جو تو ہر دم بھلا اتنا ٹٹولے تھا (۲) تصور کے سوا تیرے بتا تو اس میں کیا نکلا
ملیں اپنا حال کہہ سارا جو پوچھا وعدہ آنے کا (۳) کہا سُن سُن کے سب باتوں کچھ آخر مدعا نکلا
مری تعریف کی تھی اس سے بعضوں نے سو وہ سُنکر لگا کہنے جو سنتے تھے وہ اپنا آشنا نکلا

ملے ہے درد اس کے ساتھ دیکھا تو غریبی سے
گھمنڈ اس کے جو تھا جی میں سوا شاید گیا نکلا

---

(۱) ۳-۲-۱ - اس غزل کے شروع کے تینوں شعر قطعہ بند ہیں۔ پہلے شعر میں ایک واقعہ ہے۔ معشوق کے ملنے کا۔ دوسرے میں عاشق معشوق

سے کہتا ہے کہ تو جو میرے دل کی ٹوہ لیتا ہے۔ سچ بتا اتنی تلاش کے بعد سوائے اپنے خیال کے تو نے خانۂ دل میں کچھ اور پایا۔ تیسرے شعر میں کہتا ہے کہ جب میں نے حالِ دلِ دیدار طلب اُس کو سُنایا تو اس نے جواب دیا کہ جناب کا مدعا معلوم ہو گیا۔ نیز یوں سمجھئے کہ دوسرے شعر کا جواب دیتے ہوئے معشوق کہتا ہے کہ ہاں میرے خیال کے سوا بھی تیرے دل میں کچھ نکلا اور وہ مدعا تھا۔ "نیز دل ٹٹولنا" محاورے میں رازِ دل معلوم کرنے کی کوشش کرنے کو بھی کہتے ہیں۔

ترے کہنے سے میں از بسکہ باہر ہو نہیں سکتا
(۱) ارادہ صبر کا کرتا تو ہوں پر ہو نہیں سکتا

کہا جب میں ترا بوسہ تو جیسے قند ہے پیارے
لگا تب کہنے پر قندِ مکرر ہو نہیں سکتا

دلِ آوارہ اُلجھے یاں کسو کی زلف ہے یارب
علاج آوارگی کا اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

مری بے صبریوں کی بات سُن سب سے وہ کہتا ہے
(۲) تحمل مجھ سے بھی تو حال سُن کر ہو نہیں سکتا

کرے کیا فائدہ ناچیز کو تقلید اچھوں کی
(۳) کہ جم جانے سے کچھ اولا تو گوہر ہو نہیں سکتا

نہیں چلتا ہے کچھ اپنا تو تیرے عشق کے آگے
ہمارے دل پہ کوئی اور تو در ہو نہیں سکتا

کہا میں یوں تو جاتے ہو آ کر بعد مدت کے
(۴) اگر چاہو تو یہ کیا تم سے اکثر ہو نہیں سکتا

لگا کہنے سمجھ اس بات کو ٹک تو کہ جلد اتنا
(۵) ترے گھر آنے جانے میں مرا گھر ہو نہیں سکتا

بچوں کس طرح میں لے درد اس کی تیغ ابرو سے
کہ جس کے سامنے آ کوئی جاں بر ہو نہیں سکتا

---

(۱) کہنے سے باہر ہونا۔ حکم سے سرتابی کرنا۔

(۲) اس شعر میں تحمل کے دو معنی لئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو رنج و غم کا تحمل

نہیں ہو سکتا اور ترس آجاتا ہے۔ دوسرے غصّے کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اور بگڑ بیٹھتا ہے۔

(۳) ابر ہی کا پانی جم کر اولا بنتا ہے اور وہی پانی منجمد ہو کر موتی بنتا ہے۔ لیکن مراتب میں فرق ہے۔

۵ - ۴ - یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ صرف ایک محاورہ شرح طلب ہے۔ "گھر نہ ہونا" عورتوں کی زبان میں میاں بیوی میں ناچاقی ہو جانے نباہ نہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ساس بہو سے کہتی ہیں "بیٹی روز کے روز خیر سے تمھاری اماں جان ڈولی بھیج دیتی ہیں۔ ان گنوں تو گھر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

ہے اے پری تجھی تئیں آئینہ ناز کا (۱) جب تک ہے دل کے شیشہ میں رنگ امتیاز کا
دامن ہے ہاتھ میں مرے اس بے نیاز کا جس کی جناب کے یہ سبھی ناز ہیں نیاز
اک عمر سے اسیر ہوں زلف دراز کا ہے گو تہی اجل کی طرف سے ہی ورنہ میں

اے دردؔ اس جہان میں آکر صدائے غیب
بے پردہ ہوئے جس سے وہ پردہ ہے ساز کا (۲)

---

(۱) عاشق کے جذباتِ تعشق معشوق کو معشوق بناتے ہیں۔ امتیازِ نظر ہی حسن کو یہ امتیاز بخشتا ہے۔

(۲) خواجہ میر دردؔ کے سلسلے میں سماع مزامیر کے ساتھ جائز تصور کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ پردۂ ساز میں صدائے غیب سنائی جاتی ہے۔ مدعا یہ، کہ سماع سالکِ راہِ حقیقت کے لئے

خضر راہ ہے۔ غول بیابانی نہیں۔

گل و گلزار خوش نہیں آتا (۱) باغ بے یار خوش نہیں آتا
اے جنوں جیب میں ترے ہاتھوں ایک بھی تار خوش نہیں آتا
کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور اے ستمگار خوش نہیں آتا
درد ہم یہ رات دن تیرا
نالۂ زار خوش نہیں آتا

---

(۱) خوش نہیں آتا۔ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ زیب نہیں دیتا۔

بھرا مے سے نہیں یہ نور سے معمور ہے شیشا تجلی پر نظر کر اس کی کوہ طور ہے شیشا
شتابی میکدہ میں آ کہیں تجھ بن تو اے ساقی (۱) پڑا ہے جام بے کیفیت و مخمور ہے شیشا
بغل میں اپنے بیٹھا ہے لئے یہ دختر رز کو (۲) نہ پوچھو اس کو مینا دانۂ انگور ہے شیشا
بچایا محتسب کے ہاتھ سے اے درد میں لیکن
(۳)
مرے دل کی طرح میری بغل میں چور ہے شیشا

---

(۱) ساقی آئے گا تو شیشہ سے شراب جام میں انڈیلے گا۔ اس کے بغیر شیشہ تو شراب سے بھرے ہیں مخمور ہیں اور خالی پڑے ہیں۔ نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے مخمور نشے کے آثار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ساقی کے بغیر جام بے کیف اور شیشہ بے نشہ ہے۔
(۲) شیشہ شراب کو محیط کئے ہوتا ہے اور شراب انگور کے عرق سے

کشید کی جاتی ہے۔ اور انگور بھی اپنے میں وہ رس لئے ہوئے ہے۔ جس سے
شراب بنتی ہے۔ یہ ہے وجہ شبہہ۔

(۳) گو شیشہ ہم نے محتسب کے ہاتھ سے بچا لیا۔ لیکن ہماری بغل
اس درجہ شکستگی کی متحمل ہے کہ وہاں آتے ہی ہمارے دل کی طرح ٹوٹ کر
رہ گیا۔ نیز یہ بھی کہہ سکتے۔ کہ پہلو میں تپشِ عشق تھی اور آگ سے شیشہ چٹخ
جاتا ہے۔

اے شانہ تو نہ ہو جو دشمن ہمارے جی کا
کہیں دیکھیو نہ ہووے زلفوں کا بال بیکا
پھیلا ہے کفریاں تک کا فر ترے سبب سے
(۱) شمعِ حرم بھی دے ہے ماتھے پہ اپنے ٹیکا
گذرا اتھا بعد مدت وہ سامنے سے ہوکر
(۲) اے کوتہیٔ نالہ یہ وقت تھا گئی کا
جوں شمع تو نے جید ھر نظریں اٹھا کے دیکھا
پروانہ وار جی ہی جاتا رہا کسی کا

---

(۱) شمع کی لو کو ٹیکے سے مشابہ کر رہا ہے۔
(۲) گئی کرنا محاورہ ہے۔ درگذر کرنا۔ جانے دینا۔ نظر انداز کر دینا۔
چھوڑ دینا۔ چشم پوشی کرنا۔ ممنون کہتے ہیں۔ ع کرتے بھی ہیں کسی نہ کسی بات
پر گئی۔

شاعر کہتا ہے کہ معشوق ایک مدت کے بعد میرے سامنے سے گذرا تھا۔
اے نالہ کی کم رسی۔ کم اثری و کوتہی اس وقت تو تو مجھے درگذر کرتی۔ پیچھا چھوڑتی
کہ میں دل بھر کر نالہ کر لیتا۔ پھر یہ دن کب نصیب ہو گا۔

تو بھی نہ اگر ملا کرے گا　　عاشق پھر جی کے کیا کرے گا
اپنی آنکھوں اُسے میں دیکھوں　　ایسا بھی کبھو خدا کرے گا
گر ہیں یہی ڈھنگ تیرے ظالم
دیکھیں گے کوئی وفا کرے گا (۱)

---

(۱) اگر تمھارے یہی طور طریقے ہیں تو ہم کو بھی دیکھنا ہے تم سے کون وفا کر سکتا ہے۔

اہلِ زمانہ آگے بھی تھے اور زمانا تھا　　پر اب جو کچھ ہے یہ تو کسو سے سنا نہ تھا
چٹکا عبث نہیں کوئی غنچہ چمن میں آہ (۱)　　اے توسن بہار تجھے تازیانہ تھا
باور نہیں ابھی تجھے غافل پہ عنقریب
معلوم ہووے گا کہ یہ عالم فسانہ تھا

---

(۱) قدرت کا کوئی کام بغیر وجہ نہیں ہوتا۔ حتےٰ کہ چمن میں غنچے کے چٹکنے میں بھی مصلحت مضمر ہے۔ اس آواز سے توسنِ بہار چمک گیا۔ اور گلستاں کی طرف تیز گامی سے روانہ ہوا۔ شعر کے معنی یہاں ختم ہو جاتے۔ اگر شاعر مصرعہ اولیٰ میں لفظ آہ نہ لاتا۔ آہ میں یہ پہلو ہے کہ آسمان و زمین کے ہر فعل میں مصلحت عاشق کی دل آزاری ہے غنچہ کا چٹکنا وجہ بہار ہوا اور بہار وجہِ جنون و پریشانیٔ عاشق۔

حال یہ کچھ تو ہے اب دل کی توانائی کا (۱)　　کہ یہ طاقت نہیں لوں نام شکیبائی کا

اے شبِ ہجر نہیں ہے یہ سیاہی تیری (۲) خون گردن پہ ہے تیری کسی سودائی کا
نام سنتا نہیں زاہد تری حرمت کا کوئی
شور ایسا ہے جہاں میں مری رسوائی کا

---

(۱) لفظ "توانائی" کا طنزاً کہا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ دلِ محزون و غمزدہ اب اس درجہ ناتواں ہوگیا ہے کہ صبر کرنے کی طاقت تو درکنار اس میں اتنی سکت نہیں کہ لفظِ صبر کی برداشت کر سکے۔

(۲) شبِ ہجر عاشق کی نگاہ میں تیرہ و تار ہوتی ہے۔ سودائی خون سیاہی لئے ہوتا ہے۔ سودائی دیوانے کو کہتے ہیں۔ اس شخص کو بھی جس میں خلطِ سودا غالب ہو۔ جس کی زیادتی اکثر وجہ جنون ہوتی ہے۔ اس خلط کا رنگ چونکہ سیاہ ہے۔ اس وجہ سے اس کا غلبہ ہوتا ہے تو خون سیاہی مائل ہوجاتا ہے۔ شاعر شب ہجر کو عاشق کا قاتل قرار دے رہا ہے اور ثبوت یہ پیش کرتا ہے کہ اس کا رنگ سیاہ ہے اور اس کی سیاہی کی یہ وجہ ہے کہ سودازدہ عاشق کو قتل کیا ہے اور اس کے خون کی تیرگی طاری ہے۔ (حسن تعلیل)

کہاں کا ساقی اور پینا کدھر کا جام و پیمانا (۱) مثالِ زندگی بھر لے اب اپنا آپ ہی پیمانا
کسو سے کیا بیاں کیجے اس اپنے حال ابتر کو (۲) دل اس کے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا
نظر جب دل پہ کی دیکھا تو مسجودِ خلائق ہو
کوئی کعبہ سمجھتا ہے کوئی سمجھے ہے بتخانہ

---

(۱) زندگی اپنا جام حیات خود بھر رہی ہے۔ ساقی کی دست نگر نہیں۔ تجھے چاہئے کہ تو بھی اب اسباب کی زنجیروں کو توڑ دے۔ کسی کا محتاج نہ رہ۔ جو کام کرنا ہے کر گزر۔ تیرا حریف کسی کی امداد کئے بغیر تیری میعادِ حیات ختم کرتا چلا جا رہا ہے۔ لازم ہے کہ تجھے بھی جو کچھ کرنا ہے اپنے بل بوتے پر کر گزر۔

(۲) معشوق حقیقی کے ادراک سے محروم ہیں تاہم دل اسے سونپ دیتے ہیں۔ ہماری پریشان حالی و ابتری کا کیا پوچھنا۔ اس شمع کے پروانے ہیں جس کو جانتے تک نہیں۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن　　　دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن

لے شمع روئے بس کہ تیرا انتظار تھا　　　میں ایک ہی سا شعلۂ صفت بیقرار تھا

ظالم یہ صیدِ دل سرِ فتراک سے ترے (۱)　　　اس وقت سے بندھا ہی کہ تونے سوار تھا

مُدت کے بعد خط سے یہ ظاہر ہوا کہ عشق

(۱) تیری طرف سے حسن کے دل میں غبار تھا

---

(۱) فتراک۔ شکار بند۔ نے سوار۔ چھوٹی عمر کے بچے ٹانگوں میں سرکنڈے لے کر پھرتے ہیں۔ اس وجہ سے نے سوار کہلاتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تو ابھی عہد طفولیت میں تھا کہ میں تجھ سے دل لگا بیٹھا۔

(۲) اس شعر میں صنعتِ ایہام ہے۔ ظاہرا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسن نے عشق کو خط بھیجا ہے۔ اور اس میں ایسی جلی کٹی باتیں لکھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے، کہ حسن ایک عرصے سے عشق کی طرف سے دل میں غبار یعنی

کدورت، عداوت اور دشمنی لئے بیٹھا تھا۔ لیکن حقیقت میں خط بمعنی سبزۂ خط ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق کے چہرے پر جو سبزۂ خط نمودار ہوا وہ اس امر پر دال ہے کہ حسن عشق کی جانب سے کدورت رکھتا تھا۔ چونکہ سبزۂ خط چہرے پر تیرگی پیدا کرتا ہے اور رُخ کی صفائی میں فرق آجاتا ہے۔ اس بنا پر اُسے غبار یا تکدّر سے مشابہ کرسکتے ہیں۔ نیز دل میں غبار ہونا یا کدورت ہونا محاورے میں عناد و دُشمنی کے معنی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں مرد کے چہرے پر بال آجانے اس کے حسن کی کمی کا باعث ہیں۔ اور یہ امر عاشق پہ گراں۔ پس مطلب ہر پہلو سے یہ ہوا کہ حسن جو عشق سے دشمنی رکھتا تھا وہ اب تک پوشیدہ تھی۔ لیکن سبزۂ خط سے ظاہر ہوگئی۔ منظرِ عام پر آگئی۔

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا
یعنی کبھو تو اپنے بھی دل تھا دماغ تھا

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا (۱)
وہ گُل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

گذروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

---

(۱) وہ گُل جو مدتوں چشم و چراغِ چمن رہا۔ وہ پھول جو ایک عرصے زینت دہ صحنِ چمن رہا۔ آج کوڑے کرکٹ خس و خاشاک کے ساتھ نذرِ آتش کردیا گیا۔ پھونک دیا گیا۔ جلا دیا گیا۔ گُل جو گل خوردہ عاشق کو کسی گلعذار کی یاد دلا کر جلاتا تھا۔ آج خود پڑا جل رہا ہے۔ اس دنیا کا اعتبار نہیں جسے سر چڑھاتی ہے۔ اس ہی کو نظروں سے گراتی ہے۔ یہ عالمِ فانی ہے۔ یہاں کی

ہر شے آنی جانی ہے۔ اگر اس دنیا میں ثبات ہے تو بے ثباتی کو۔

رُباعیات

تجھ کو اے انتظار دیکھ لیا	کچھ کشش نے ترے اثر نہ کیا
جوں جوں میں آنسوؤں کو اپنے پیا	تشنگی اور بھی بھڑکتی گئی

فارسی میں انتظار کرنے کے معنی میں انتظار کشیدن آتا ہے۔ مثلاً
ع بہ تنگ آمدہ ام چند انتظار کشم

شاعر اسی مناسبت کے مدنظر انتظار سے خطاب کر کے کہتا ہے۔ کہ تجھ کو بھی آزما دیکھا۔ تیری کشش بھی کارگر نہ ہوئی۔ یا یوں سمجھئے کہ احباب کہتے تھے۔ انتظار کرو خود آجائے گا۔ وہ بھی کر دیکھا۔ پر وہ نہ آنا تھا نہ آیا۔ آنسوؤں کو پیا یعنی گریہ کو روکنا۔ آہ و نالے کو ضبط کرنا۔ جس وقت آدمی آنسوؤں کو روکتا اور گھونٹتا ہے تو حلق میں کانٹے پڑتے معلوم ہوتے ہیں اور یہ علامت انتہائے تشنگی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایک طرف تو میں آنسو پی رہا ہوں اور دوسری جانب تشنگی بڑھتی جاتی ہے۔ مدعا یہ کہ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اُدھر انتظار نتیجہ خیز نہ نکلا۔ اِدھر آنسوؤں کے پینے سے پیاس اور بھڑکی۔

زلفوں میں کسو کے جو گرفتار نہ ہوتا
کچھ کام مجھے تجھ سے شب تار نہ ہوتا

مرنا ہی لکھا ہے مری قسمت میں عزیزاں
گر زندگی ہوتی تو یہ آزار نہ ہوتا

ایک تو ہوں شکستہ دل تس پہ یہ جور یہ جفا
سختی عشق واہ واہ جی نہ ہوا ستم ہوا

جان کے بدلے میرے ساتھ وعدہ اک نگاہ تھا
سو بھی نہ تجھ سے ہو سکا مفت ہی مفت جی لیا

جلوہ تو ہر ایک طرح کا ہر شان میں دیکھا
جو کچھ کہ سنا تجھ میں سو انسان میں دیکھا

جوں غنچہ بجز اک دل صد چاک نہ پایا
منہ ڈال کے جب اپنے گریبان میں دیکھا

جلوۂ خداوندی تو ہر شے میں موجود ہے۔ تمام کائنات اس خالقِ مطلق کے وجود پر دلیل ہے۔ لیکن مظہر صفات الٰہی صرف انسان ہی ہے۔ تاہم جب اپنی طرف غور کیا اور بنظرِ غائر ڈالی تو اس جسد خاکی میں ایک دل ہی دل تھا۔ جو عشق حقیقی سے چاک چاک ہو رہا تھا جو سر تو ایزدی سے مالامال تھا۔ باقی سب ہیچ تھا۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں اپنی حقیقت پر غور کرنا۔

ناصح میں دین و دل کے تئیں اب تو کھو چکا
حاصل نصیحتوں سے جو ہونا تھا ہو چکا

زاہد کیا کرے ہے وضو گو کہ روز و شب
چاہے کہ دل سے دھوئے کدورت سو دھو چکا

ناصح نادان کی تلقین ہے کہ دین و دل کی حفاظت کرو۔ نہ دل کسی کو دو نہ دین ہاتھ سے کھوؤ۔ نہ دل کو بے قابو ہونے دو نہ حدود شرع سے باہر

قدم رکھو۔ لیکن تیری یہ نصیحتیں اب بے سود ہیں۔ ان پر عمل ہو چکا۔ یعنی ان پر عمل ہونا اب ممکن نہیں۔ تو اس وقت رو کئے آیا جب تیر کمان سے نکل چکا۔ میں یہ کام کر چکا۔ لیکن اتنا تو گوش گذار کر دینا چاہتا ہوں کہ صفائے قلب پابندئ شریعت سے ممکن نہیں۔ عابد و زاہد کتنا بھی وضو کرے۔ دل کی کدورت کو دور نہیں کر سکتا۔ مدعا یہ ہے کہ جس راہ پر عابد جا رہے ہیں وہ منزل مقصود تک پہنچانے والی نہیں۔

مذکور جانے بھی دو ہم دلِ طپیدگاں کا
احوال کچھ نہ پوچھو آفت رسیدگاں کا

موجِ نسیم گو ہے زنجیر بوئے گل کی
دامن نہ چھو سکے پر از خود رمیدگاں کا

جو خودی کو بھول چکے۔ بے خودی کی منازل میں ہیں۔ اُن کا ذکر ہی کیا وہ تو اس درجے آزاد ہیں کہ موج صبا جو بوئے گل تک کو اپنا پابند کر لیتی ہے۔ ان کی ہوا کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ مدعا یہ کہ منازل پر از خود رفتگان ہیں وہاں ادراک و فہم کا گذر نہیں۔

مدت تئیں باغ و بوستاں کو دیکھا
یعنی کہ بہار اور خزاں کو دیکھا

جوں آئینہ کب تلک پریشان نظری
اب موندیئے آنکھ بس جہاں کو دیکھا

دیکھا ہے میں زندگی کا جب سے سپنا
جلنا ہی سدا ہے مجھ کو نت ہے کھپنا

تقصیر معاف تب ہی ہوگی اے درد
جوں شمع کروں گا جب قدمبوس اپنا

جب سے اس حیات فانی کا خواب پریشان دیکھا ہے۔ مسلسل جل رہا ہوں۔ گھل رہا ہوں۔ پگھل رہا ہوں اور ختم ہوا جا رہا ہوں۔ مجھ پر ہمہ وقت یہ عذاب نازل ہے۔ اور اس سے گلو خلاصی صرف اس وقت ہوگی۔ جب کہ شمع کی مانند گھل گھل کر اپنے قدموں کو خود بوسہ دے لوں۔ یعنی فنا ہو جاؤں۔ جب تک زندگی ہے آلام زندگی سے نجات ناممکن۔ ع

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

اے درد یہ کون صبر کو لوٹ گیا
یوں تجھ سے جو ضبط یک بیک چھوٹ گیا
کیا تجھ پہ مصیبت پڑی ایسی ظالم
کہہ تو سہی جے ڈھاکہ دل ٹوٹ گیا

عاشق تجھ کو جو گھر نہ پاتا ہوگا
کیا کیا کچھ دل میں اس کے آتا ہوگا
اوروں سے بھی تجھ کو تو خوشی حاصل ہے
تیرا جی وہاں بھی بہل جاتا ہوگا

پیدا کرے ہر چند تقدس بندا
مشکل ہے کہ حرص سے ہو دل برکندہ
جنت میں بھی اکل و شرب ہے کب ہے نجات
دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندا

چوتھے مصرعہ میں دوزخ، کے معنی دوزخ شکم ہیں۔

اے درد یہ بیٹھنا جو آکر دیکھا
کچھ تو ہی بتا کہ دل لگا کر دیکھا
مانند مژہ اُٹھ گئی صف کی صف ہے
ہم نے تو جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھا

دنیا میں ہر شخص کو ڈانوا ڈول پاتے ہیں اے درد تجھ تو ہی اس آبلہ فریب کی حقیقت کو بتا۔ تو نے تو یہاں دل بھی لگایا ہے۔ ہم کو تو اس عالم میں سوائے فنا کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ جدھر بھی نظر ڈالی مثلِ مژہ صف کی صف اُٹھتی دکھائی دی۔ اُٹھنا بمعنی مرنا۔ نیز صفِ مژہ اُٹھائے بغیر یعنی پلکیں اونچی کئے بغیر آدمی دیکھ بھی نہیں سکتا۔ پس کچھ دیکھنے کی کوشش اس کے مرادف ہے کہ صفِ مژگاں اُٹھے۔

ہم نے بھی کبھو جام و سبو دیکھا تھا
جو کچھ کہ نہیں ہے روبرو دیکھا تھا
اُن باتوں کو اب جو غور کرے اے درد
کچھ خواب سا تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

موند آنکھ سدا کب تئیں دن ٹالیے گا
غفلت کے تئیں بغل میں یوں پالیے گا
اے درد مراقبہ تو کرتے ہو وے
ٹک اپنا گریباں میں بھی سر ڈالیے گا

کس کا کون کیا کسو سے کہنا
اپنا اپنا ہر ایک کا ہے لہنا
گذرے ہے اب اس طرح اپنی اے درد
رونا چپکے پڑے اکیلے رہنا

یارب مقصود خلق کیا میں ہی تھا
ایسا تحفہ جہاں میں یا میں ہی تھا
کچھ کام ظہور میں نہ آیا مجھ سے
بس تجھ کو یہ مجھ سے مدعا میں ہی تھا

افراد

یاں کے معشوقوں نے رسم زلف اب دی ہے اٹھا
دیکھ کر حال پریشاں عاشقان زار کا

عاشق کا دل آشفتہ معشوق کی زلفوں کو دیکھ کر پریشان حال ہوتا ہے یہاں کے معشوقوں نے جب یہ دیکھا تو زلفیں بنانے کی رسم اُٹھا دی۔ یعنی ترک کر دی۔ ایران میں زلفیں خاص خاص انداز سے بنائی جاتی تھیں۔ مثلاً حافظ کہتا ہے۔ ع اے کہ برمہ کشی از عنبر سارا چوگاں۔ برخلاف اس کے خواجہ میر درد کے زمانے میں ہندوستان میں سیدھی سادی چوٹیاں گوندھی جاتی تھیں۔ نیز اس شعر کے پڑھنے سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ایران میں زلفوں سے متعلق کوئی رسم ہو جو یہاں تک نہ آئی ہو جیسے ہندوستان میں موچھوں کا کونڈا۔ لیکن باوجود تحقیق کے کسی ایسی رسم کا پتہ نہ چل سکا۔ اس شعر کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

چونکہ معشوق کی یہ فطرت ہے کہ عاشق کی ہر چیز سے پرہیز کرتا ہے اور اس کو عاشق کی ہر شے سے ضد ہوتی ہے۔ بقولیکہ۔ ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔ لہٰذا جب اس نے دیکھا کہ عاشق پریشان ہیں تو اپنی زلفوں کو پریشان کرنا ترک کر دیا یا قطعاً زلفیں رکھی ہی نہیں تاکہ عاشق سے کسی عنوان مماثلت پیدا نہ ہو۔

محبت نے ہم کو ثمر جو دیا سو یہ ہے کہ سب کام سے کھو دیا

شکوہ تجھے کس سے ہے گلا کس سے یہ ٹھانا مانند فلک اپنی ہی گردش ہے زمانا

تو دیوانہ ہوا ہے زمانے کا گلا کر رہا ہے وہ تو خود اپنے چکر میں مبتلا ہے۔

ہم نے چاہا بھی پر اس کوچے سے آیا نہ گیا وہاں سے جوں نقشِ قدم دل تو اٹھایا نہ گیا

ہم نے کوچۂ دلدار سے آنا چاہا۔ لیکن دل کچھ ایسا پھنسا تھا کہ نکل نہ سکا۔ وہ اس گلی میں نقشِ پا کی طرح خاک اُفتادہ تھا کہ اٹھایا نہ جا سکا اور یہ حقیقت ہے کہ نقشِ پا مٹایا جا سکتا ہے۔ اُٹھایا نہیں جا سکتا۔

فلک پر کون کہتا ہے گذر آہِ سحر کرنا جہاں جی چاہے وہاں جا پر کسی دل میں اثر کرنا

غل مری زنجیر نے رفتار میں ایسا کیا حشر کو بھی شور جو ہونا نہ تھا برپا کیا

بسیار خلق کرتی ہے اپنے کمال کا یہ آئینہ ہے جلوہ فروش اُس جمال کا

ہر انسان کی قدر و قیمت اس کے کمال پر مبنی ہے۔ لیکن قلب انسانی کی منزلت انوار خداوندی سے ہے۔ جتنا یہ پر تو زیادہ اتنا ہی بیش بہا۔ مدعا یہ کہ قلب انسانی خود کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اُس کی تمام مرتبت کا

باعث جلوۂ ایزدی ہے۔

خط کے آنے سے ہوا معلوم جانا حسن کا   نوخطوں نے اب نکالا پیش خانا حسن کا

خط بمعنی سبزۂ خط۔ پیش خانہ بمعنی پیش خیمہ۔ رؤسا اور خصوصاً شاہان سلف کی سواری جب کہیں دُور جاتی تھی تو چند روز پہلے منزل پر ایک پورا محکمہ پہونچ کر خیمہ زن ہوتا۔ تمام انتظامات کرتا۔ اس کو خیمہ کہتے تھے۔ امرد کے چہرے پر بالوں کا نمودار ہونا رخصتِ حسن کا پیغام ہے جیسے پیش خیمہ یا پیش خانہ شاہ کا عزمِ سفر ظاہر کرتا ہے۔

مخالف کٹ گئے سنتے ہی مجلس میں سخن میرا   زباں کا اب ہوا معلوم جوہر تیغ ہے گویا

کٹ جانا، محاورہ ہے۔ پانی پانی ہو جانا۔ شرمندہ ہو جانا۔ جھینپ جانا۔ مجلس میں مخالفین نے جب میرا کلام سُنا تو جھینپ گئے۔ کٹ گئے۔ آج مجھ پر اپنی زبان کے جوہر کھلے، وہ تلوار کی مانند ہے۔ زبان کے ساتھ گویا اور تیغ کے ساتھ جوہر اور کٹنا۔ مراعات النظیر۔

بارے مجھے بتا تو سہی کیا سبب ہوا   پھر مجھ پہ مہربان ہوا تو غضب ہوا

گلہ کرتا نہیں میں کچھ تری نامہربانی کا   مجھے شکوہ ہے اے ظالم اس اپنی سخت جانی کا

عاشق تو ہم ہوئے پر کیا کیا عذاب دیکھا   رسوائیاں اُٹھائیں جور و عتاب دیکھا

آتشِ گل سے آج پھول پڑا   آشیانے میں دردِ بلبل کے

دوسرے مصرعہ میں پھول سے مراد آگ کی چنگاری ہے۔ اب بھی حقہ پینے والے جب چلم پر تھوڑی آگ رکھنے کو کہتے ہیں تو یہ فقرہ استعمال کرتے ہیں۔ میاں ذرا دو پھول رکھ لاؤ۔ یا جب یہ کہنا منظور ہوتا ہے کہ چولھے کو بالکل ٹھنڈا نہ کرنا۔ چنگاری رہنے دینا۔ تو کہتے ہیں بھئی چولھے میں وقت بے وقت کے لئے دو پھول رہنے دینا۔ موسم گل بلبل کی آتشِ عشق بھڑکانے کا باعث اس کی آہ و فغاں، شیون و نالہ، آشیانہ ویراں کا سبب۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ آتشِ گل نے بلبل کے نشیمن کو آگ لگائی۔

ردیف الباء

تھا عدم میں بھی مجھے اک پیچ و تاب (۱) مضطرب ہو جس طرح موجِ شراب
بے بضاعت ہیں سب اہلِ زرق و برق (۲) چشمۂ خورشید میں کید ھر ہے آب
موت ہے آسائشِ اُفتادگاں (۳) چشمِ نقشِ پا کا مٹ جاتا ہے خواب
کیوں نہ ہو شرمندۂ روئے زمیں (۴) سیلِ اشک ایسا نہیں خانہ خراب
ہے تنک ظرفوں کو بے جامے کشی جامِ مے کب ہو سکے جامِ حباب
چل نہ جاویں ہیں جو صاحب حوصلہ (۵) پائے خمِ لغزش میں کب لاوے شراب
ہنستے ہیں کوئی کبھو دل مردگاں (۶) گو رکے لب پر تبسم کیا حساب
مے کشاں کرنے لگے محنت کشی
درد ہوتا ہے دل یاراں کباب

---

(۱) روحِ انسانی عدم میں بھی بے قرار تھی جس طرح کہ شراب خواصِ آتشیں لئے ہوئے ہے۔ سوز و گداز کی متحمل۔ ہیجانی کیفیات کی خزینہ دار۔ اسی طرح قلبِ انسانی باوجود ظاہری سکون کے۔ طلاطم خیز طوفان اپنے میں چھپائے ہوئے ہے۔

(۲) اوپری ٹیپ ٹاپ والے اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ جو دیکھو تو، سب کچھ ٹٹولو تو ہیچ۔ تھوتا چنا باجے گھنا۔ مثال کے طور پر چشمہ خورشید کو دیکھ لو۔ چشمہ کہلاتا ہے۔ انتہائی آب و تاب رکھتا ہے۔ لیکن پانی ایک بوند نہیں۔

(۳) خاک اُفتادہ نظروں سے گرے ہوئے ناکام لوگوں کے لئے

صرف موت ہی گلو خلاصی و آسائش ہے۔ جس طرح نقشِ پا دیدہ وا رہتا ہے۔ آنکھ نہیں بند کر سکتا۔ آرام نہیں پاتا جب تک مٹا نہ دیا جائے۔ نقش پا کے لئے فنا ہونا اور آرام پانا مترادف ہیں۔ افتادگان کے لئے نقشِ پا کی مثال نہایت مناسب ہے۔

(۴) سیل اشک زمین کے چہرے میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس کا وہ دائمی ٹھکانا ہے۔ سیل اشک کو مطلقاً خانہ خراب نہ سمجھنا اس کے لئے مادرِ زمین آغوشِ محبت وا کئے ہے۔ آنکھیں نکال پھینکتی ہیں۔ چہرے پر سے بہ جاتا ہے۔ سینۂ زمین میں جگہ پاتا ہے۔

(۵) حوصلہ، لغوی معنی میں پرند کے پوٹے کو کہتے ہیں۔ زبان میں گنجائش کے معنی دیتا ہے۔ شراب کے تمام ظروف میں زیادہ سے زیادہ گنجائش خم میں ہوتی ہے۔ پس صاحب حوصلہ کہلایا۔ نیز میخانے میں ایک جگہ رکھا رہتا ہے۔ ہلایا جلایا نہیں جاتا اس کے پیر کو لغزش نہیں۔ حالانکہ شراب سے لبریز ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ تنگ ظرف شراب پی کر لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اہلِ ظرف اپنے مقام پر قائم رہتے ہیں۔ خم کو دیکھ لو۔ چل جانا بمعنی بہک جانا۔

(۶) جن کے دل مر گئے اُن کے لئے ہنسنا اور خوش رہنا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قبر کے کنارے پر بیٹھ کر خندہ زنی۔ وہ تو اپنے دل کا جنازہ ہمہ وقت پہلو میں لئے پھرتے ہیں۔ اُن کو ہنسی دل لگی سے کیا واسطہ۔

ردیف التاء

دو مو کمر کہیں تو ہوا بے حجاب رات　　تھا مثلِ زلف دل کو عجب پیچ و تاب رات

ہم روسیاہ دن کو تو کیا منہ دکھا سکیں (۱) جوں شمع چاہتے ہیں کہ ہووے شتاب رات
تیری گلی میں اے بت بے مہر ون کی طرح لایا تھا پھر مجھے دلِ خانہ خراب رات
وں تم تو اپنے خوش رہے ہو گئے پہ کیا کہوں گذرا ہے میرے جی پہ جو کچھ یاں عذاب رات
تو شام سے جو اے مرے خورشید رو گیا انجم کی طرح آئی نہ آنکھوں میں خواب رات

میرے گناہ آتے ہیں کوئی شمار میں
اے درد میں نے جی میں کیا تھا حساب رات

---

(۱) شمع کو روسیاہ اس نسبت سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بتی گل خوردہ ہوتی ہے اور اوپر سے سیاہ۔

زاہد اگر نہیں کی تو نے کسو سے بیعت (۱) پیرِ مغاں کی ہاں کر دستِ سبو سے بیعت
زلفِ بتاں سے کہنا ہے وقتِ دستگیری (۲) اس سلسلے میں کی ہے دل نے کبھو سے بیعت
گو کھینچ کھینچ چلے جان اپنی شیخ کھووے کوئی زندہ دل کرے ہے اس مردہ خو سے بیعت

---

(۱) صوفیہ کے خیال میں سالک کے لئے کسی نہ کسی سلسلے میں بیعت لازم ہے اور زاہد اس کے قائل نہیں۔ خواجہ میر درد اپنے مسلک کے مطابق کہتے ہیں کہ اگر تو اب تک کسی پیرِ طریقت کی بیعت سے محروم ہے۔ تو اب میخانے میں آ۔ دستِ سبو ہی سے بیعت کر لے۔ سبو میں دستی یا ہینڈل ہوتا ہے اس وجہ سے دستِ سبو کہا گیا۔

(۲) "سلسلہ" اصطلاح میں پیری اور مریدی کے سلسلے کو کہتے ہیں اور یہ چار مشہور ہیں۔ نقشبندیہ۔ چشتیہ۔ سہروردیہ۔ اور قادریہ۔ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی

شخص کسی سلسلے میں بیعت ہو تو اس سلسلے کے ہر چھوٹے اور بڑے کا فرض ہے کہ منازلِ عرفان میں اس کی دستگیری کرے۔ زلفِ بتاں زنجیر کی صورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو بھی سلسلہ کہا۔ اور دل عاشق مدت سے اس سلسلے میں ہے۔ یعنی اس سلسلے میں مرید ہے۔ پس زلفوں کے لئے لازم آیا کہ ہر کڑی منزل میں اس کی دستگیری کریں۔

ردیف الجیم

آیئے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ
اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

آئینے کی طرح غافل کھول چھاتی کے کواڑ
(۱) دیکھ تو ہر کون بارے تیرے کاشانے کے بیچ

سیر باغ و بوستاں تو ہے میسر ہر گھڑی
آیئے گا ہے فقیروں کے بھی ویرانے کے بیچ

جو مزے ہیں مرگ میں سو ہم سے پوچھا چاہئے
کون جانے آہ کیا ذلت ہے مر جانے کے بیچ

عقدۂ دل کھول مثلِ قطرہ ناداں کب تلک
(۲) جو گہر غلطاں رہیگا آب اور دانے کے بیچ

پیچ و تاب اتنا جو ہے یاں اس دلِ صد چاک کو
زلف الجھے ہے کسو کے ظاہرا شانے کے بیچ

بخت خواب آلود نے میرے سلایا اسکو درد
ورنہ پھونکا تھا ہی افسوں میں نے افسانے کے بیچ

---

(۱) اے بے خبر آئینے کی طرح اپنے دل کو وا کر۔ اپنے سینے کو کھول اور پھر دیکھ اس خانۂ دل میں کون براجمان ہے۔ آئینے کا سینہ کشادہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر عکس اس میں جاگزیں ہو سکتا ہے اور ہر پرتو جگہ پاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ "بارے" ذرا وقت طلب ہے۔ اگر اس مصرعہ کو یوں پڑھیں تو

صاف ہوجائے گا۔ بارے تو دیکھ تو سہی تیرے کاشانے کے بیچ کون ہے۔ زبان میں اکثر "بارے" التجا اور درخواست کے معنی دیتا ہے۔ لیکن پرانی اردو میں "بارے" کے ایک اور بھی معنی ہیں اور وہ بھی شعر میں لگ سکتے ہیں یعنی "بار" سے "بارے" مہمان ہونے کے معنی ہیں، سامان اتارنے اور ٹکنے کے معنی میں آتا ہے۔

(۲) دل کو گھونٹ نہیں اُس میں انقباضی کیفیت پیدا نہ کر۔ قطرے کی طرح منبسط رہ۔ گوہر کی مانند آب ودانہ کے چکر میں نہ رہ۔ آب ودانہ یہاں دو معنی دیتا ہے۔ گوہر دانے کی شکل کا ہوتا ہے، نیز آبدار بھی۔ اُس کی صفت ہی آبداری ہے۔ آب ودانے کے دوسرے معنی فکرِ معاش کے ہیں۔ شاعر کا مطلب ہے کہ قطرۂ انبساط اور فراخدلی سے کام لیتا ہے۔ دریا میں شامل ہوجاتا ہے۔ لہروں سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ سمندر بن جاتا ہے۔ گوہر انفرادیت کو قائم رکھتا ہے۔ سمندر جز و نہیں بن سکتا تجھے لازم ہے قطرے کی طرح دریا سے یک جان ہوجا۔ اپنی حقیقت کو اُس میں غرق کردے۔ گوہر کے مانند الگ تھلگ نہ رہ۔ نیز تلاشِ معاش یا تلاشِ معیشت تجھے راہِ حقیقت سے بھٹکا نہ دے۔

ندکور جب چلے ہے مرا انجمن کے بیچ — کچھ آپ ہی آپ سیج وہ رہتا ہی من کے بیچ
اے بے خبر تو آپ سے غافل نہ بیٹھ رہ — جوں شعلہ یاں سفر ہی ہمیشہ وطن کے بیچ
تجھ کو نہیں ہیں دیدۂ بینا وگرنہ یاں — یوسف چھپا ہے آن کے ہر پیرہن کے بیچ

سودا! اگرچہ درد تو خاموش ہے ولے
جوں غنچہ سو زبان ہیں اُس کے دہن کے بیچ

باب الرا

کیونکر میں خاک ڈالوں سوزِ دلِ طپاں پر (۱) مانند شمع میرا کب حکم ہے زباں پر
میں کس طرح بتوں کے لا سامنے جھکا دوں (۲) دل تو دماغ اپنا کھینچے ہے آسماں پر
کب اختیار اپنا جوں گل ہے اس چمن میں گلچیں سے کیا چلے ہے کیا زور باغباں پر
چاہے کہ بات جی کی منہ پر نہ آئے میرے اپنے وہاں کو لاکر رکھ دے مرے وہاں پر
میں جانتا نہیں ہوں بیٹھے بٹھائے یارب یوں آپڑی کہاں سے آفت یہ میری جاں پر
تارِ نگہ پہ دل یاں دونوں طرف سے روٹے دو نٹ مقابل آویں جس طرح ریسماں پر

اے دردِ یار جیسا ہووے سو ہے غنیمت
اتنا بھی جی نہ رکھئے ہر وقت امتحاں پر

---

(۱) خاک ڈالنے سے آگ بجھ جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ قلبِ سوزاں پر میرا قابو نہیں۔ جو اس کی لگی بجھا دوں جیسے کہ شمع کو اپنی زبان یا لو پر قدرت نہیں ہے۔ شمع کی زبانِ شعلہ افشاں اس کی ہستی کو ختم کئے دے رہی ہے۔ وہ عاجز ولاچار ہے بعینہٖ میرا دلِ طپاں میرے لئے وجہ ہلاکت ہے لیکن میں بے دست وپا ہوں میری اس کے آگے ایک نہیں چلتی۔ اس شعر میں ایک اور معنی بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ شمع کو تو اپنی زبان پر قابو ہے۔ اور اس نے اسے خموش کر رکھا ہے لیکن مجھے دلِ سوزاں پر دست رس نہیں۔ میں آہ و فغاں سے باز نہیں رہ سکتا۔ لیکن راقم الحروف کی رائے میں پہلے معنی زیادہ قرین ہیں۔

(۲) مجھے آسمانی خدا کی اُلفت ہے۔ اس کی تلاش ہے۔

ساقی ہے چڑھا آج تو یہ رنگ گھٹا پر
شیشہ ہو گرے پھیکنے گر سنگ ہوا پر

ہے اور ہی جلوے کی غرض بوقلمونی
یہ قوس قزح کا نہیں نیرنگ ہوا پر

گھبرا کے دلِ تنگ جو کوئی سانس نکالے
(۱) اک دم میں ہو عرصہ تو ابھی تنگ ہوا پر

جوں کاغذ باد اہل ہوس بیچ میں ہینگے
(۲) رہتی ہے سدا اُن کے تئیں جنگ ہوا پر

مانند حباب آہ تنک ظرف جہاں کے
(۳) یاں کرتے ہیں سر کھینچنے کے ڈھنگ ہوا پر

تو ہی نہیں ساقی تو جسے ابر ہیں کہتے
اپنی ہی نظر میں یہ بندھا رنگ ہوا پر

ہر دم دلِ بیتاب مرا درد کرے ہے
(۴) جوں نغمہ نکل آنے کا آہنگ ہوا پر

---

(۱) ہمارے دلِ تنگ میں ایسی آہیں بھری ہیں کہ اگر ہم سانس بھی لیں تو ہوا کی پہنائیوں میں اپنے لئے جگہ نہ پا سکے۔

(۲) بعض نسخوں میں "بیچ میں" ملتا ہے اور بعض میں "پیچ میں" درج ہے۔ پہلے ہم "پیچ میں" سے معنی کرتے ہیں۔ کاغذِ باد: بمعنی پتنگ۔ دوسرے مصرع میں "ہوا" ہوا و ہوس کے معنی دے رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے اہل ہوا و ہوس ہمیشہ پیچ و تاب میں رہتے ہیں۔ خواہشاتِ دنیا اُنھیں مصروف جدال و قتال رکھتی ہیں۔ نیز کاغذ باد۔ پیچ اور ہوا مراعات النظیر پیدا کر رہے ہیں۔ اب بیچ سے معنی کیجئے۔ شاعر کہتا ہے کہ اہلِ ہوس پتنگ کی طرح معلق ہیں۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

(۳) کم حوصلہ لوگ ذرا سے سہارے پر سر کبر غرور بلند کر لیتے ہیں۔ جیسے حباب جہاں ذرا سی ہوا ملی اور سر اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ سرافرازی کی ہوا باندھنے لگا۔

(۴) دوسرے مصرعہ کا "آہنگ" پہلے مصرعہ کے "کرے ہے" سے پہلے لگا دیجئے معنی صاف ہوجائیں گے۔ مطلب یہ کہ ارادہ کرتا ہے۔ نیز آہنگ اور نغمے کا ایک جا لانا لطف سے خالی نہیں۔

مہربانی اُس قدر نامہربانی اس قدر
اُس قدر تھا یا کرم یا ظلم راتی اس قدر

(۱) دشمنی مجھ سے نہ کرلے ناتوانی اس قدر
جان کنج آنے دے لب تک نزع میں کب تک رہوں

کوئی بھی بے ربط ہوتی ہے کہانی اس قدر
کیا کہوں دل کا کسو سے قصۂ آوارگی

درد تو کرتا ہے معنی کے تئیں صورت پذیر
دسترس رکھتے تھے کب بہزاد و مانی اس قدر

---

(۱) ناتوانی اس درجے ہے کہ میری جان میں بھی اتنی جان نہیں، سکت نہیں، طاقت نہیں کہ چل کر ہونٹوں تک آجائے۔ جان ناتواں کی اس ناتوانی کے باعث میں حالتِ نزع میں ہوں۔ نہ جان چل کر ہونٹوں تک آتی ہے نہ میرا دم نکلتا ہے۔

---

(۱) یکتا ہوں مثلِ آئینہ اور ہی جمال کر
مشہور خلق میں نہیں اپنے کمال کر

(۲) ٹک تو ہی لے جبین عرق انفعال کر
آنکھیں تو آنسوؤں سے کبھی تر نہیں ہوئیں

آنکھوں نے دل کو کیونکہ دیا دیکھ بھال کر
حیرت ہے یہ کہ تجھ سے ستمگر کے ہاتھ میں

لے درد کر ٹک آئینۂ دل کو صاف تو
پھر ہر طرف نظارۂ حسن و جمال کر

---

(۱) "کر" بمعنی وجہ۔ ہیں دنیا میں کسی، اپنے کمال کی بنا پر مشہور خلق نہیں۔ بلکہ ایک اور ہی ذات کے پرتو کے کرم سے مجھے یہ امتیاز و شرف حاصل ہے۔ جیسے کہ آئینہ روشناس عالم اس بنا پر ہے کہ دوسروں کے پرتو کا حامل ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر اس کا ہم معنی ہے۔
بیپار خلق کرتی ہے اپنے کمال کا + یہ آئینہ ہے جلوہ فروش اس جمال کا
(۲) شاعر کہتا ہے کہ ہم اپنی سیاہ کاریوں پر کبھی نہیں روئے۔ کاش آنکھوں میں آنسو نہیں آتے تو پیشانی پر عرق ندامت ہی آجاتا۔

فرد

ہنس قبر پہ میری کھل کھلا کر ‏ ‏ یہ پھول چڑھا کبھی تو آکر

ردیف الزای

(۱) کیا ہوا مر گئے آرام ہے دشوار ہنوز ‏ ‏ جی میں تڑپے ہے پڑی حسرت دیدار ہنوز
(۲) ہر لبِ زخم نمک سود ہے گو مثل سحر ‏ ‏ شکوہ آلود نہیں پر لبِ اظہار ہنوز
(۳) کر چکا اپنی سی عیسے ابھی تو پر کیا حاصل ‏ ‏ ہیں گے دل سے ہی ترے چشم کے بیمار ہنوز
(۴) موڑ یو منہ نہ ابھی سوزن مژگاں ہم سے ‏ ‏ ٹانکے زخموں میں تو ہیں کتنے ہی درکار ہنوز
(۵) ہے خیال اس کی ہی زلفوں کا دم آخر بھی ‏ ‏ بندھ رہا ہی مری نظروں میں وہی تار ہنوز
اور تو چھوٹ گئے مر کے بھی اے کنج قفس ‏ ‏ ایک ہم ہی ہیں بہر طرح گرفتار ہنوز
یار جاتا تو رہا نظروں سے کب کا لیکن ‏ ‏ دل میں پھرتی ہی مرے در دوہ رفتار ہنوز

(۱) عاشقِ خدا کو بعدِ مرگ بھی سکون نصیب نہیں۔ قبر میں بھی خواہش دیدار تڑپاتی رہتی ہے۔ جنتیوں سے قیامت کے بعد وعدۂ دیدار ہے۔ کلام پاک میں آیا ہے کہ اہلِ بہشت کو اگر کوئی آرزو ہوگی تو وہ دیدار خداوندی کی۔ شاعر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرے عاشق بعد فنا بھی شوق دیدار میں مبتلا رہیں گے۔

(۲) زخموں پر نمک چھڑکنا یا اُن کو نمک آلود کرنا نہایت کرب کا باعث ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے ہمارے زخم گو مانند صبح آسودۂ نمک ہیں۔ لیکن لب وفا آشنا حرف شکایت سے آشنا نہیں۔

(۳) اس شعر میں دل سے ہی" کی جگہ ویسے ہی پڑھا جائے تو شعر بالکل صاف ہوجاتا ہے۔ لیکن اول الذکر الفاظ سے یہی معنی ہو سکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ مسیحا نے بھی اپنی سی کوشش کر لی۔ لیکن تیرے بیمار دل کی طرح کرب وبلا میں مبتلا ہی رہے۔ صحت نہ پا سکے، ان کے مرض کا مداوا نہ ہو سکا۔

(۴) محاورے میں "منہ موڑ لینے" کے معنی ساتھ چھوڑ دینے کے ہوتے ہیں۔ سوئی کا منہ موڑ لینا مترادف ہے، اس کے ناکارہ ہو جانے کے۔ آج کل کی سوئیاں سخت لوہے کی ہوتی ہیں۔ وہ مڑتی نہیں ٹوٹتی ہیں۔ خواجہ میر درد کے زمانے کی دیسی سوئیاں نرم لوہے کی ہوتی تھیں اور مڑ جایا کرتی تھیں۔ سوزنِ مژگاں پہلے ہی خمیدہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ سوزنِ مژگانِ یار ہمارا ساتھ نہ چھوڑ۔ ابھی تو تجھے ہمارا مداوا کرنا باقی ہے۔ نیز زخموں کا سینہ باعثِ اذیت بھی ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ابھی تو تجھے دکھ دینے ہیں۔

(۵) اس شعر میں دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم "تار بندھنے" کے محاورے میں معنی لیں، تو کسی چیز کا مسلسل قائم رہنا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ دمِ آخر بھی تیری

زلفوں کا خیال برابر چلا آرہا ہے۔ نیز اگر ہم تار سے مراد تار نظر لیں تو یہ معنی کہ دمِ نزع بھی تار نظر کی جگہ زلفوں ہی کا تار ہے۔

پھرتا ہے کس تلاش میں یہ آسماں ہنوز (۱) لیتا نہیں کبود کی اپنے عناں ہنوز
لگتی نہیں ہے تالو سے میری زباں ہنوز (۲) ہے بعد مرگ بھی وہی آہ و فغاں ہنوز
توحید تو بھی ہوئی نہیں ہے عیاں ہنوز (۳) موجود بوجھتا نہیں کوئی کسو کے تئیں
سو سو طرح کی ہجر میں ہوتی ہے جانکنی مرتا نہیں ہوں تو بھی تو میں سخت جاں ہنوز
ہر چند کہنہ سال ہے دنیا تو کس قدر آتی ہے پر نظر میں سبھوں کی جواں ہنوز

کعبے میں درد آپ کو لایا ہوں کھینچ کر
دل سے گیا نہیں ہے خیالِ بتاں ہنوز

---

(۱) چابک سواروں کی اصطلاح میں "عنان لینا" باگیں کھینچنے کے معنی میں آتا ہے۔ قدیم خیال کے مطابق آسمان گردش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آسمان کو کس کی تلاش ہے جو متواتر کاوے کاٹ رہا ہے۔ گردش میں ہے۔

(۲) "تالو سے زبان نہ لگنا" محاورے میں چپ نہ ہونے کے معنی دیتا ہے۔

(۳) ابھی تک دُنیا پوری طرح وحدت الوجود کی قائل نہیں ہوئی۔

رباعی

کوہ کن سے نہ بول اے پرویز اس کے تیشہ کی بھی زباں ہے تیز
ساقی اب سب پکارتے ہیں گے تیرے ہاتھوں سے یاں بریز بریز

شیریں فرہاد کے قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

فرد

برمیں مرے وہ سیمبر آیا نہیں ہنوز
مقصود میرے دل کا بر آیا نہیں ہنوز

ردیف السین

نہ کیا تونے ایک بار افسوس
حال پر میرے صد ہزار افسوس
جو کہ ہونا تھا دل پہ ہو گذرا
نہ کرا ے درد بار بار افسوس

ردیف الطاء

کرتا رہا میں دیدۂ گریاں کی احتیاط
پر ہو سکی نہ اشک کے طوفاں کی احتیاط
خارِ مژہ پڑے ہیں مرے خاک میں ملے (۱)
اے دشت اپنے کیجیو داماں کی احتیاط
جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں
گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط
تیرے ہی دیکھنے کے لئے آئینے کی طرح
کرتا ہوں اپنے دیدۂ حیراں کی احتیاط
دل کے تئیں گرہ سے کبھو کھولتی نہیں
ہے زلف کو بھی اپنے پریشاں کی احتیاط
داغوں کی اپنے کیوں نہ کرے درد پرورش
ہر باغباں کرے ہے گلستاں کی احتیاط

(۱) شاعر انتہائے آوارگی و صحرا نوردی دکھاتا ہے۔

ردیف الغین

وابستہ میرے قتل سے تھی آبروئے تیغ (۱) لایا نہ تھا تو آج تک ہاتھ سوئے تیغ
کرتا نہیں وہ بات سو گفتگوئے تیغ (۲) ناچار مجھ سے اوس سے تو قطع کلام ہے
بارے کہیں ٹھکانے لگی جستجوئے تیغ (۳) کیجے نہ قتل اہل وفا جتنے ہیں یہ سب
میری طرح نہ ٹھہرے کوئی رُوبروئے تیغ جانباز اور بھی ہیں پر لے ابروانِ یار
برلائیے کبھو تو میاں آرزوئے تیغ پیاسی مرے لہو کی وہ رہتی ہے دمبدم
ایک اُس کی خوئے تند سے ملتی ہے خوئے تیغ کوئی مزاج داں نہ ہوا آج تک مگر

اے درد مثل زخم زمانے کے ہاتھ سے
دیکھا نہ آنکھ کھول کے ہم غیر روئے تیغ (۴)

---

(۱) تیرا ہاتھ آج تک کسی کے لئے سوئے تیغ گیا ہی نہ تھا۔ اب میں قابلِ قتل قرار پایا۔ تو نے تیغ کی جانب رجوع کیا۔ اس کی بھی آبرو ہوئی۔ آب اور تیغ میں مناسبت ہے۔

(۲) "قطع کلام" بات چیت نہ ہونا۔ سلسلۂ گفتگو نہ ہونا۔ قطع اور تیغ مراعات النظیر۔

(۳) مصرعہ اولیٰ کا "نہ" نفی کا نہیں تاکید کا ہے۔

(۴) حقیقت ہے کہ زخم کو سب سے پہلے جو چیز نظر آتی ہے وہ تیغ ہے چشمِ زخم آنکھ کھولتے ہی تلوار دیکھتی ہے۔

فساد

اے درد ایک خلق ہے جانانہ کی طرف — لازم ہے کیجئے دل دیوانہ کی طرف

(۱) طرف کرنا بمعنی حمایت کرنا۔ اُس دور کی زبان ہے۔ اب طرفداری کرنا آتا ہے۔

ردیف الکاف

پیغام یاس بھیج نہ مجھ بے قرار تک — ہوں نیم جاں سو بھی ترے انتظار تک

دے وہ شراب ساقی کہ تا روزِ رستخیز (۱) — جس کے نشے کا کام نہ پہونچے خمار تک

صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو — پھر کس کو زندگی کی توقع بہار تک

بے قدر میکشی ہوئی عالم میں یاں تئیں — ہے صرفِ شیشہ شیخ کا سنگِ مزار تک

راہِ عدم میں درد میں اتنا ہوں تیز رو
پہونچا صبا کا ہاتھ نہ میرے غبار تک

---

(۱) اے پیر طریقت ایسی شرابِ معرفت پلا جس کے نشہ قیامت تک گھٹے رہیں۔ خمار نشہ کے اترنے کی حالت کو کہتے ہیں۔

(۲) دنیا میں شراب نوشی کی اس درجے بے قدری ہوئی، اتنی اہانت ہوئی کہ شیخ کے سنگِ مزار جیسی مبتذل اور مکروہ شے کا بھی شیشہ بنا لیا گیا۔ ابتدا میں صراحی بلور کی بنتی تھی۔ اور بلور کان میں سے نکلتا ہے پس شیشہ اور سنگ کا تعلق تمام شعراء کے ہاں پایا جاتا ہے۔

رباعیات

پھرتا رہا میں سعی میں ایک عمر جوں فلک　　بختِ سیاہ پر نہ پھرے میرے اب تلک
چونکا ہوں درد جب سے اُسے دیکھ خواب میں　　لگتی نہیں ہے تب سے پلک سے مری پلک

بخت پھرنا، قسمت پھرنا. خوش طالعی کا زمانہ آنے کے معنی دیتا ہے۔
پلک سے پلک نہ لگنا. آنکھ نہ جھپکنے، نیند نہ آنے کے معنی میں آتا ہے۔

نہیں میرے تئیں کسی کا باک　　اب گریباں میں ہاتھ ہے اور چاک
گرد تو ہو گئے تیرے عاشق　　کیا ستم ہو زیادہ اس سے خاک

ردیف اللام

کچھ دل ہی باغ میں نہیں تنہا شکستہ دل　(۱)　ہر غنچہ دیکھتا ہوں تو ہیگا شکستہ دل
ہاتھوں سے محتسب کے ہیں اب میکدے کے بیچ　(۲)　ساغر شکستہ خاطر و مینا شکستہ دل
شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل　(۳)　گُل کو شگفتہ دل کہو تم یا شکستہ دل
یارب درست گو نہ رہوں تیرے عہد پر　　بندہ سے پر نہ ہو کوئی بندہ شکستہ دل
کی جس کی جوں حباب زمانے نے دل وہی　　چھوڑا نہ پھر اُسے نہ کیا تا شکستہ دل
لازم ہے گوشۂ شکنِ زلف میں ترے　　ظالم کوئی پڑا رہے مجھ سا شکستہ دل
سب خونِ دل ٹپک ہی گیا بوند بوند کر
اے درد بسکہ عشق سے میں تھا شکستہ دل

(۱) اس دُنیا میں ہر شے شکستہ دلی کا شکار ہے۔ باغِ جہاں میں غنچہ تک باوجود صغر سنی کے شکستہ دل پاتا ہوں۔

(۲) شکستہ خاطر، شکستہ دل، دونوں کے معنی۔ پریشان، مایوس، ناامید حرماں زدہ کے ہیں نیز محتسب کا کام میخانے کو برباد کرنا، ساغر و مینا کا توڑنا، چکنا چور کرنا ہے۔ اس وجہ سے شکستہ دلی و شکستہ خاطری لغواً بھی صحیح ہے اور اصطلاحاً بھی۔

(۳) پہلے مصرعہ میں شاعر دعویٰ کرتا ہے کہ دُنیا کے شادی و غم میں فرق نہیں۔ دونوں ایک سے ہیں۔ غم پر شادی کا اشتباہ ہوتا ہے اور شادی غم کے ہم معنی۔ دوسرے مصرعہ میں ثبوت دیتا ہے کہ غنچے کو دیکھ لو اس پر شگفتہ دلی اور شکستہ دلی دونوں کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مدّت سے بے چراغ پڑا تھا دیارِ دل (۱) بارے یہ داغِ عشق ہوا شہر یارِ دل

کرتا ہوں اب تلک میں پڑا انتظارِ دل تیری کہیں گلی کے گیا تھا خیال میں

اُٹھتا ہے بعدِ مرگ بھی مانند گرد باد

لے ورد خاک سے مری اب تک غبارِ دل

---

(۱) شہر یا گھر کا بے چراغ ہونا مترادف ہے سونا ہونے، غیر آباد ہونے، اور برباد ہونے کے۔ شہر میں جب بادشاہ نہ ہو تو وہ بے رونق سا رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ داغِ عشق بغیر شہرِ دل سونا پڑا تھا۔ اب جب سے یہ اس میں جاگزیں ہوا اُس کی چہل پہل بڑھ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشق اس شہر کا شہر یار تھا۔

ردیف المیم

حیراں آئینہ دار ہیں ہم (۱) کس سے یارب دوچار ہیں ہم
پانی پر نقش کب ہے ایسا (۲) جیسے ناپائدار ہیں ہم
ساقی کیدھر ہے کشتیٔ مے اب کی کھیوے میں پار ہیں ہم
جی بھی پنپا کبھو نہ اپنا اتنے زار و نزار ہیں ہم
اوروں کے گو ہیں سُرمۂ چشم (۳) اپنے دل کے غبار ہیں ہم
کوئی کیونکر نظر میں لاوے (۴) تنگ چشم شرار ہیں ہم
آتش میں ہیں پہ مثلِ شعلہ از سرتا پا بہار ہیں ہم
چشم عبرت سے دیکھ ادھر (۵) نقش لوحِ مزار ہیں ہم
جیدھر گذرے پھرے اودھر سے (۶) آوازۂ کوہسار ہیں ہم
ازبسکہ ہیں محو لا تعیّن (۷) ہر جا بے اعتبار ہیں ہم
مجنوں ہو خواہ کوہکن ہو عاشق کے دوستدار ہیں ہم
اپنے ملنے سے منع مت کر اس میں بے اختیار ہیں ہم
یوں تو عاشق بہت ہیں لیکن اس طور کے گنتے یار ہیں ہم

مجنوں فرہاد و زرد و وامق
ایسے یہ دو ہی چار ہیں ہم

---

(۱) ایسی کونسی ہستی سے ہمارا سامنا ہوگیا ہے کہ ہم یعنی انسان اہلِ دل آئینہ ہ مانند چشمِ حیرت وا کئے بیٹھے ہیں۔ یعنی عالم امکان میں ہم کو شانِ خدا نظر آئی۔ ر اس نے ازخود رفتہ کردیا۔

(۲) پانی پر نقش۔ نقش برآب کا ترجمہ ہے۔ ناپائداری کے معنی دیتا ہے۔

(۳) انسان گو دوسروں کے واسطے شمع راہ ہے۔ لیکن اُس کی ہستی اُس کے آئینۂ دل کے لئے زنگ ہے غبار ہے۔

(۴) "نظر میں لانا" قدر و منزلت کرنا۔ نیز دکھائی دینا۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا عرصہ حیات، ہماری معیارِ زندگی اس قدر کم ہے، محدود ہے، قلیل ہے کہ نہ نظر آتی ہے نہ نظروں میں سماتی ہے۔

(۵) اگرچہ چشمِ دوربیں سے دیکھا جائے تو ہر ایک چلتا پھرتا زندہ انسان موت کی خبر دے رہا ہے۔ بقا آئینہ دارِ فنا ہے۔ حیات پیامِ ممات لئے ہوئے

(۶) شاعر کہتا ہے کہ انسان کا اس جہان میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ وہ مردودِ خلائق ہے۔ ڈانوا ڈول پھرتا ہے جیسے کوہسار میں آواز کہ چاروں طرف ٹکراتی پھرتی ہے اور کہیں سماتی نہیں۔

(۷) اس غیر متعین ذات کی جستجو میں اس درجے از خود رفتہ ہیں کہ دُنیا کی نظروں میں اپنا اعتبار بھی کھو بیٹھے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس ہستی میں ہم اس درجے محو ہیں کہ اب ہم کو کسی چیز کا اعتبار نہیں رہا۔ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اُسے اس حقیقت کے مقابل دھوکہ تصور کرتے ہیں۔ ہم لاتعین میں ایسے کھوئے گئے ہیں کہ اس عالم تعینات کی ہر چیز کا اعتبار ہمارے دل سے اُٹھ گیا ہے۔

اب کے ترے در سے گر گئے ہم — پھر یہ ہی سمجھ کے مر گئے ہم

چوں نورِ بصر ترا تصور (۱) — تھا پیش نظر جدھر گئے ہم

فخرِ اہلِ صفا بنا تو چوں عکس (۲) — اے آئینہ کس کے گھر گئے ہم

کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے　　معلوم نہیں کدھر گئے ہم
تھا عالمِ جبر کیا بتا دیں　　کس طور سے زیست کر گئے ہم
جس طرح ہوا اُسی طرح سے　　پیمانۂ عمر بھر گئے ہم

افسوس کہ درد اس کو جب تک
ہوئے ہی خبر گذر گئے ہم

---

(۱) ہمہ اوست۔
(۲) آئینہ کا سینہ غبار و کدورت سے صاف ہوتا ہے۔ پس عکس اسی میں اپنا گھر بناتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی انہی کے پاس گئے جن کے دل کدورت سے صاف تھے۔ جو صاف باطن تھے۔

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم　　تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم
جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی　　(۱) ساتھ اپنے دوچار ہو گئے ہم
ماتم کدۂ جہاں میں جوں ابر　　اپنے تئیں آپ رو گئے ہم
ہستی نے تو ٹک جگا دیا تھا　　پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم

یاروں ہی سے درد ہے یہ چرچا
پھر کوئی نہیں ہے جو گئے ہم

---

(۱) ہر ہستی میں وہی ذاتِ واحد ہے۔ اس مسئلے کو شاعر مثال دے کر واضح کرتا ہے۔ کہتا ہے جب انسان آئینے کی طرف دیکھتا ہے تو اس میں اپنا ہی عکس پاتا ہے۔ اُسی طرح ہم نے جس انسان کی طرف دیکھا وہاں اسی

ایک ذات کا جلوہ پایا جو ہم میں موجود تھی۔ پس ایسا معلوم ہوا کہ کوئی غیر نہ تھا۔

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم
بہار باغ گو یونہی رہے لیکن کدھر شبنم

عرق کی بوند اس کی زلف سے رخسار پر ٹپکے (۱)
تعجب کی ہے جا گہہ یہ پڑی خورشید پر شبنم

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم

کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیر صحبت صاف طبعوں کی
ہوئی آتش سے گل کی بیٹھتے رشک شرر شبنم (۲)

بھلا ٹک صبح ہونے دو ولے بھی دیکھ لیویں گے
کسی عاشق کے رونے سے نہیں رکھتی خبر شبنم

نہیں اسباب کچھ لازم سبکساروں کے اٹھنے کو (۳)
گئی اڑ دیکھتے اپنے بغیر از بال و پر شبنم

نہ پایا جو گیا اس باغ سے ہرگز سراغ اس کا
نہ پلٹی پھر صبا ایدھر نہ پھر آئی نظر شبنم

نہ سمجھا درد ہم نے بھیدیاں کی شادی و غم کا
(۴) سحر خنداں ہے کیوں روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

---

(۱) زلفوں میں سے پانی کی بوندیں تیرے رخسار پر ٹپک رہی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ تو خورشید رو ہے پھر تیرے چہرے پر شبنم کیسی۔ سورج نکلتا ہے تو شبنم نہیں رہتی۔ یہاں یہ عجب ماجرا ہے کہ خود خورشید پر شبنم جاگزیں ہے۔

(۲) پہلے مصرعہ میں شاعر دعویٰ کرتا ہے کہ صاف باطنوں کی صحبت قلب ماہیت کر دیتی ہے۔ دوسرے میں نہایت خوشنما ثبوت دیتا ہے۔ کہتا ہے شبنم کا قطرہ جو بالذات سفید ہے۔ جب صحبت گل سے فیضیاب ہوتا ہے۔ رنگ شرر اختیار کرتا ہے اور سرخ معلوم ہونے لگتا ہے۔

(۳) جو لواحقات دنیوی سے آزاد ہیں اُن کے لئے اس عالمِ تکوین و ایجاد سے دل اٹھا لینا ایک کھیل ہے۔ یا یہاں سے کوچ کر جانا کوئی وقت

طلب امر نہیں۔ شبنم کو دیکھو با وجود بال و پر نہ ہونے کے دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہوگئی۔

(۴) راز دنیا نہ سمجھ سکے۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را۔ ہم یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ عالم ایجاد عشرت گاہ ہے یا غمکدہ۔ ایک طرف صبح ہنستی ہے تو دوسری طرف اوس روتی ہے۔ نیز جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ صبح کی وجہ خندہ اور شبنم کی علت گریہ کیا ہے تو ایک راز معلوم ہوتا ہے جس کو سمجھنے سے ہم اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں۔

رباعی

کیا کہیں سوئے فنا کس طور کر جاتے ہیں ہم
شمع کے مانند سر کے بل اُدھر جاتے ہیں ہم
ہے کسے جوں شعلۂ ظالم آہ تاب انتظار
جب تلک دیکھے ادھر تو یاں گذر جاتے ہیں ہم

---

(۱) شاعر حیات مستعار کی ناپائداری مثال دے کر بیان کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ شعلۂ حیات راہ فنا میں کسی کی راہ نہیں دیکھتا۔ کوئی ہماری جانب ملتفت ہو خواہ نہ ہو میعاد حیات ختم ہوتی جا رہی ہے۔ نیز شمع سر کی طرف سے آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے اس مناسبت سے کہا جا سکتا ہے کہ شمع راہ پر سر کے بل بے سپر ہے علاوہ ازیں محاورے میں سر کے بل جانا نہایت شوق کے ساتھ جانے کے معنی میں آتا ہے۔

فرد

خلق میں ہیں پر جدا سب خلق سے رہتے ہیں ہم
تال کی گنتی سے باہر جس طرح روپک میں ہم

(۱) ہم دنیا میں ہیں تاہم تعلقات سے غیر متعلق یہ دعویٰ ہے۔ جس کو خواجہ میر درد موسیقی سے متعلق تمثال دے کر ثابت کر رہے ہیں۔ روپک تال۔ ایک تال کا نام ہے جیسے تتالا۔ چوتالا۔ تمام تالوں میں سم پر ضرب ہے۔ اس کلیہ سے روپک مستثنیٰ ہے۔ اس تال میں سم دبا ہوا آتا ہے اور تال کی گنتی میں شمار نہیں کیا جاتا۔

تن ۱ (سم) تن ۲ ترکٹ ۳ دھن ۴ دھن ۵ دھا ۶ دھا

پس جس طرح روپک میں سم موجود ہے لیکن گنتی میں نہیں آتا بعینہٖ اہل اللہ دنیا میں ہیں لیکن دنیا والوں میں ان کا شمار نہیں۔

ردیف النون

گلیم بخت سیہ سایہ دار رکھتے ہیں (۱) یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں
بسانِ کاغذِ آتش زدہ مرے گلرو (۲) ترے جلے بھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں
یہ کس نے ہم سے کیا وعدۂ ہم آغوشی کہ مثلِ بحر سراسر کنار رکھتے ہیں
ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی (۳) کہ جو کچھ اوچھی ہی جی میں سو ہار رکھتے ہیں
بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ سب اہلِ قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں
جہاں کے باغ سے ہم دل سوا نہ پھل پایا (۴) فقط یہی ثمرِ داغدار رکھتے ہیں
اگرچہ دخترِ رز کے ہے محتسب در پے (۵) جو ہو سو ہو پر اُسے اب تو یار رکھتے ہیں
برنگِ شعلہ غمِ عشق ہم سے روشن ہے کہ بیقراری کو ہم برقرار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر مگر یہ زندگیٔ مستعار رکھتے ہیں
فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلوگیری یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں

بتوں کے جبر اُٹھائے ہزار ہا ہم نے جو اس پہ بھی نہ ملیں اختیار رکھتے ہیں

بھری ہے آکے جنوں میں ہوائے آزادی (۶) حباب وار کلہ بھی اُتار رکھتے ہیں

نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلہ نے سیماب وہ کچھ ہیں پر کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں

جنھوں کے دل میں جگہ کی ہے نقش عبرت نے سدا نظر میں وہ لوح مزار رکھتے ہیں

ہر ایک سنگ میں ہے شوخیٔ بتاں پنہاں (۷) خنک ہیں سب پہ یہ دل میں شرار رکھتے ہیں

وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا
اگرچہ درد اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

---

(۱) جس طرح سے کہ سایے پر ایک تیرگی و تاریکی چھائی ہوتی ہے، اُسی طرح ہم پر بھی بخت سیاہ طاری ہے۔ ہماری بے برگ و نوائی کی یہ انتہا ہے کہ کل اثاثہ ایک کمبل اور وہ بھی بخت سیاہ کا۔ نیز سایہ زمین پر پڑتا ہے۔ اس مناسبت سے شاعر اپنے کو خاکسار کہہ رہا ہے۔ اس شعر میں لفظِ "بساط" لطف سے خالی نہیں۔ چونکہ بساط کے لغوی معنی فرش کے ہیں۔

(۲) کاغذِ آتش زدہ پر جگہ جگہ داغ پڑ جاتے ہیں جن کو پھولوں سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔

(۳) "اُدیچ کی لینا" اور "اُدیچ اُٹھنا" نئی بات پیدا کرنا۔ دل میں اُمنگ اُٹھنا۔ ولولہ پیدا ہونا۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم ہمیشہ فتح مند و فیروز بخت ہے۔ اس دلیل یہ ہے کہ جو بھی اُمنگ دل میں اُٹھی ہم نے اس پر فتح پالی۔ اُس کو دبا لیا۔

(۴) اس شعر میں شاعر کا زمانہ کی ستم کاریوں کی جانب اشارہ ہے۔ کہتا ہے اگر دنیا نے ہم کو کچھ دیا تو وہ ایک دلِ داغ داغ تھا۔ یہ "پھل پانا" نتیجہ اور حصول کے معنی دیتا ہے۔ نیز باغ اور پھل مراعات النظیر۔

(۵) محتسب کا کام ہی شراب یعنی دختِ رز کے درپے ہونا ہے۔ محاورے میں درپے کے معنی کوششِ حصول کے ہیں۔ اردو میں بامحاورہ ترجمہ، پیچھے پڑنا ہے۔ شاعر انتہائے شوخی سے کام لیتا ہے اور فرائضِ محتسب کو عجب رنگ میں پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے دختِ رز کی تلاش میں محتسب بھی لگا ہوا ہے۔ وہ بھی اس کے پیچھے پڑا ہے ولے ہرچہ بادا باد اس وقت تو وہ یاروں کے پاس ہے۔

(۶) حباب ہوا کا کھیل ہے۔ جب تک ہوا نہ بھرے بلبلہ پیدا نہیں ہوتا۔ نیز اس کی شکل کچھ اس قسم کی ہوتی ہے جیسے کلاہ برسر ہو اور پھر اس سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ حباب کا کلاہ اُتارنا اُس کے فنا ہو جانے کے مترادف ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جن کے دلوں میں خواہشِ آزادی بھری ہے۔ وہ قیدِ رسوم کے پابند نہیں۔ وہ ٹوپی تک کے زیرِ بار نہیں ہوتے۔ خواہ اس کے اُتارنے میں موت کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

(۷) پتھر کو جب ٹکرائیے تو شرارہ دیتا ہے۔ اُسی طرح معشوق بھی گو دیکھنے میں سرد مہر ہیں۔ لیکن جلانے میں کمال رکھتے ہیں۔

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے درد آپ کہ میری فروتنی
(۱) اُفتادہ ہوں یہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
(۲) پر آہ میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں

یہ چاہتی ہے تو طپشِ دل کہ بعد مرگ
کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے دردِ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غمزدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

(۱) لمبی چیز کا سایہ اس کے قدموں سے دُور پڑتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ گو ہم خاک نشین ہیں۔ لیکن نہایت خود دار، مطالب دنیوی سے کھنچے رہتے ہیں۔ لواحقات سے کشیدہ۔

(۲) موجِ نسیم باغ میں ٹکے گی نہیں۔ رواروی میں ہے۔ بوئے گل جو اس سے اختلاط بڑھا رہی ہے۔ خلا ملا کر رہی ہے، وہ نتیجہ خیز نہیں۔ باغ سے مراد دُنیا ہے اور صبا سے انسان۔ شاعر کا مطلب ہے کہ دُنیا انسان کی طرف ملتفت ہے۔ لیکن وہ بر دوش پا در رکاب۔

(۳) اب میری حالت قابلِ ضبط نہیں۔ میری مثال اُس آنسو کی طرح ہے جو آنکھ سے ٹپک چکا۔ جب تک آنکھ میں روکا جا سکتا ہے۔ ضبط کیا جا سکتا ہے جب باہر آیا قابو سے باہر ہوا۔

آ دشتاق ترے مفت موئے جاتے ہیں
اک نظر بھولے سے بھی ہووے تو جی پاتے ہیں

گو سلامت رہوں ظاہر ہیں پہ دل کے خطرات
رات دن گھن کی طرح میرے تئیں کھاتے ہیں

تو بھی اے پائے طلب ٹک تو بھلا خواب سے چونک (۱)
اپنی ہی نوع سی ہیں وہ جو پہونچ جاتے ہیں

ہم سے بیکار رواں سے بہتر ہیں یہ اہلِ اشغال (۲)
ہر طرح دل کے تئیں اپنے تو بہلاتے ہیں

درد کی طرح وہ ہو جاتے ہیں کچھ اور سے اور
تیرے از خود شدگان جبکہ بخود آتے ہیں

---

(۱) اے دل خوابیدہ، نیند کے ماتے جاگ۔ قربِ خدا انسانوں ہی کو حاصل ہوتا ہے

(۲) "اہلِ اشغال" زاہد۔

(۳) تیسرے دیوانے جب بے خود ہوتے ہیں تو بھی اُن پر عجب کیفیت ہوتی ہے نیز جب اپنی حقیقت سے آشنا ہوش و حواس میں ہوتے ہیں تو بھی اُن پر ایک خاص عالم ہوتا ہے۔ غرضکہ عاشقانِ خدا ہر حال میں ایک حال میں ہوتے ہیں۔

گر دیکھئے تو مظہرِ آثارِ لقا ہوں (۱) در سمجھئے، جوں عکس مجھے محو فنا ہوں

کرتا ہوں پس از مرگ بھی حل مشکل عالم (۲) بے حس ہوں پہ ناخن کی طرح عقدہ کشا ہوں

ممنون مرے فیض کے سب اہلِ نظر ہیں (۳) جوں نور ہر اک چشم کا دیدار نما ہوں

ہے آسترِ فقر اگر سمجھو تو شاہی (۴) سلطاں ہے اگر شاہ تو میں ظلِّ ہمایوں

ہے مظہرِ انوارِ صفا میری کدورت (۵) ہر چند کہ آہن ہوں پر آئینہ بنا ہوں

احوال دو عالم ہے مرے دل پہ ہویدا (۶) سمجھا نہیں تا حال پر اپنے تئیں کیا ہوں

آواز نہیں قید میں زنجیر کے ہرگز (۷) ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

ہوں قافلہ سالارِ طریقِ قدما درد
جوں نقشِ قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

---

(۱) انسان عجب اضداد کا مجموعہ ہے۔ ایک طرف تو ذات لافانی کی صفات کا مظہر، دوسری جانب خود مائل بہ فنا۔

(۲) شاعر دعوی کرتا ہے کہ انسان بعد مرگ بھی دنیا کی مشکلیں حل کرتا ہے۔ مثال ناخن کی دیتا ہے کہ وہ قطعاً بے حس ہونے کے باوجود گرہیں سلجھاتا ہے۔ عقدہ کشا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان گو خود بے حس ہو جاتا ہے تاہم مرنے کے بھی عقدہ کشا ہوتا ہے۔ عقدہ کشائی کے لغوی معنی گرہ کھولنے کے ہیں لیکن محاورے

میں کام نکالنے کے، مشکل حل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ مسلمان عام طور پر کسی نہ کسی متوفی بزرگ دین کے واسطے سے اپنی مرادوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی برآری چاہتے ہیں۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

(۳) آنکھ گو دیکھنے والی ہے۔ لیکن نور کی مدد کے بغیر نہیں دیکھ سکتی، اب اس نور کے معنی خواہ آنکھوں کی روشنی لے لیجئے جس کے بغیر دیکھنا ناممکن ہے۔ یا معمولی روشنی جس کے بغیر بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ بہر کیف شاعر کہتا ہے کہ اہلِ نظر منازلِ معرفت میں میری توجہ کے محتاج ہیں اور سالک میری رہبری کے خواہاں۔

(۴) اس شعر کا اصل مدعا یہ ہے کہ درویش شاہ گر ہوتے ہیں۔ آسن گدائی۔ جس چیز کو فقرا بچھا کر بیٹھیں۔ آسن شاعر کا مطلب ہے کہ سنگاسن آسن کی مدد سے ملتا ہے۔

(۵) لوہا صیقل ہو کر آئینہ بنتا ہے۔ خود بالذّات مکدّر ہے۔ لیکن اہل عالم کے لئے رونما۔ اسی طرح انسان گو جسدِ خاکی ہے، اسفل سے متعلق لیکن عالم علوی کا آئینہ دار۔ یعنی انسان صفات خدا کا عکس بردار ہے۔

(۶) انسان باوجود انتہائے ادراک اپنی حقیقت کو نہ سمجھا۔

(۷) اہل اللہ دنیا میں رہتے ہوئے لواحقات دنیوی سے بے تعلق رہتے ہیں۔ شاعر اس دعوے کو مثال سے سمجھاتا ہے۔ کہتا ہے کہ آواز گو زنجیر سے متعلق ہے اُس کی جنبش سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن کوئی صاحبِ فہم صوت کو زنجیر کا بندی نہیں مان سکتا۔

---

(۱) نہ ہم غافل ہی رہتے ہیں نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں انھیں طرحوں میں ہم ہر دم فنا فی اللہ ہوتے ہیں

تقیدگاہِ امکاں میں ہے وہ کچھ بخششِ مطلق (۲) کہ ہر واحد کو لاکھوں دام یاں تنخواہ ہوتے ہیں
غرورِ حسن کم ہوتا نہیں کچھ خط کے آنے سے (۳) کہ یہ سب مورچہ پے بھی سلیماں جاہ ہوتے ہیں
اگر جمعیتِ دل ہے تجھے منظور قانع ہو کہ اہلِ حرص کے کب کام خاطر خواہ ہوتے ہیں

پریکھا درد کچھ مت رکھ ترقی اور تنزل کا
کہ اپنے ذہن میں یاں تو گدا بھی شاہ ہوتے ہیں

---

(۱) نہ ذاتِ باری کا پوری طرح ادراک ہوتا ہے نہ اُس کی یاد ہی دل سے جاتی ہے جرعہ نوشانِ مئے معرفت پر ایک حالت نیم بیہوشی و خود فراموشی طاری ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ اس ذات سے جا ملتے ہیں۔

(۲) عالم تکوین و ایجاد میں اس کریم کی بذل و عطا کا نمونہ دکھا رہا ہے مطلق اور تقید میں صفت تضاد ہے۔

(۳) حضرت سلیمان اور چیونٹی کی تلمیح ہے نیز سلیماں جاہ کے خطاب سے شعر میں نُدرت پیدا کی ہے۔ نیز خط اور مورچہ پا میں مناسبت قابل داد ہے۔

تو مجھ سے نہ رکھ غبار جی میں — آوے بھی اگر ہزار جی میں
بیزار ہے مجھ سے تو پہ مجکو — اب تک ہے وہی پیار جی میں
گُل اب تو ملے ہے ہنس کے لیکن (۱) — بلبل پہ چبھیں گے خار جی میں
یوں پاس بٹھا جسے تو چاہے — پر جا گہہ نہ دیجو یار جی میں

کیا فائدہ درد شور و شر سے
اوچھی ہے جو کچھ سو مار جی میں

---

(۱) زالِ دنیا کا دروازہ التفات آٹھ آٹھ آنسو رلائے گا۔ اے بلبل اس وقت گل شگفتہ ہو کر تجھ سے مل رہا ہے۔ لیکن یاد رکھ خارِ فرقت پسِ مردہ نہال ہے۔

ہر چند تیری سمت سوا راہ ہی نہیں (۱) تس پر بھی آہ یاں کوئی آگاہ ہی نہیں
وہ مرتبہ ہے اور ہی فہم بد کے پرے (۲) ہم جس کو پوجتے ہیں وہ اللہ ہی نہیں
ہم بھی فلک سے کرتے ہیں کس چیز کی طلب ڈھونڈھا پر اپنے دل میں تو کچھ چاہ ہی نہیں
انسان کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں بازی کہاں بساط پر گر شاہ ہی نہیں
سو رنگ سے ہیں جلوہ نما گو بتانِ خلق اپنا ترے سوا کوئی دلخواہ ہی نہیں
گر کہتے ہو کہ ہے وہی ہادی وہی مضل (۳) تو راہ پر ہیں سب کوئی گمراہ ہی نہیں
اے درد مثل آئینہ ڈھونڈا اس کو آپ میں
بیرونِ در تو اپنی قدم گاہ ہی نہیں

---

(۱) اگرچہ ہر راہ اسی طرف جاتی ہے۔ تاہم انسان گم کردہ راہ ہے۔ ہر شے مظہرِ صفات خداوندی ہے۔ پھر بھی ہم ادراک سے محروم۔

(۲) ذاتِ خدا ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ ہم جس تصور کو خدا سمجھ رہے ہیں وہ اس سے کہیں بلند ہے۔ چیزے دیگر است۔ قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں۔ وہ تو محیط کل ہے احاطۂ عقل میں کیونکر آسکتا ہے۔

(۳) مضل۔ گمراہ کرنے والا۔ فلسفۂ جبر پر ایک نظر ڈالی ہے۔

ہستی ہے جبتک ہم ہیں اسی اضطراب میں (۱) جوں موج آ پھنسے ہیں عجب پیچ و تاب میں

سنے خانۂ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر (۲) رہتا ہے کون اس دلِ خانہ خراب میں
آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر (۳) ہے موج زن تمام یہ دریا سراب میں
غافل جہاں کے دید کو مفتِ نظر سمجھ پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں
ہر جزو کو کُل کے ساتھ بمعنے ہے اتصال (۴) دریا سے دُر جدا ہے پہ ہے غرق آب میں
پیری نے ملکِ تن کو اجاڑا و گرنہ یاں تھا بندوبست اور ہی عہدِ شباب میں

میں اور مجھ سے درد خریداریٔ بتاں
ہے ایک دل بساط میں سو کس حساب میں

---

(۱) قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں کے تخیل کو خواجہ میر درد مثال سے ثابت کر رہے ہیں۔

(۲) قلب انسانی مذبذب، دل ڈانوا ڈول۔ نہ پوری طرح تارکِ خواہشات ہو کر خدا سے لو لگاتا ہے۔ نہ پکا دُنیادار ہی بن سکتا ہے۔ نہ اِدھر کا ہے نہ اُدھر کا۔

(۳) ادراک عالم باقی اس عالم فانی ہی میں ممکن ہے۔ وہ ذات واحد اس کثرت میں جلوہ فرما ہے۔

(۴) جزو کل سے جدا نہیں ہو سکتا۔ مخلوق خالق سے الگ نہیں کی جا سکتی عبد، اور معبود میں افتراق ناممکن۔ اس دعوے کو شاعر عجیب انداز سے ثابت کرتا ہے۔ اوّلاً تو حروف کی ترتیب میں "دُر" دریا کا جز ہے۔ نیز موتی پانی میں پیدا ہوتا ہے۔ اور آبدار ہوتا ہے۔ اس کی آب یعنی چمک اس کا جزو لاینفک ہے۔ پس نہ لفظ دریا میں سے دُر الگ کر سکتے ہیں اور نہ "دُر" سے آب الگ کیا جا سکتا ہے۔ پس جزو کل سے جدا ہونا ممکن نہیں۔

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں ۔۔۔ دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں (۱) ۔۔۔ ہم آئینے کے سامنے جب آ کے ہو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو (۲) ۔۔۔ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم (۳) ۔۔۔ پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول (۴) ۔۔۔ منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار ۔۔۔ کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر

اے درد آ کے بیعت دستِ سبو کریں

---

(۱) آئینے سے مراد دنیا ہے۔ "ہو" اہل باطن صفائے قلب کی خاطر یہ ضرب لگاتے ہیں۔ نیز "ہو" کی ضمیر کے معنی "وہی" کے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم دنیا کے سامنے ایک مرتبہ "ہو" یعنی "وہی" کا نعرہ لگا دیں تو یہ کثرت وحدت سے بدل جائے۔

(۲) "تردامنی" بمعنی گناہگاری۔

(۳) عاشقانِ خدا کو رخصتِ گویائی نہیں۔ بودیم شمع شوق و زبانے نداشتیم۔

(۴) آئینے میں جب چہرہ دیکھئے تو چہرے کے عکس کی پشت آئینے کی جانب ہوتی ہے۔

یہ زلفِ بتاں کا گرفتار ہیں ہوں ۔۔۔ یہ بیمار چشموں کا بیمار ہیں ہوں

کدھر ہی کی پھرتی ہے اے بیکسی تو ۔۔۔ تری جنس کا یہاں خریدار ہیں ہوں

ادھر بات کہنا ادھر دیکھ لینا ۔۔۔ سمجھتا ہوں سب ایک عیّار ہیں ہوں

اگر مجھ سے ملئے کبھو عیب کیا ہے	نہ بد وضع تو ہے نہ بدکار میں ہوں
کسو پر بلا تیری تیوری چڑھاوے	تری تیغ ابرو کا انگار میں ہوں
سبھی اپنے جینے سے اے درد خوش ہیں
مگر ہوں تو یہ ایک بے زار میں ہوں

---

(۱) یہ بمعنی اس درجہ۔ اس قدر۔

اس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں	پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں
آجائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بہ تنگ	جیتا رہیگا کب تئیں اے خضر مر کہیں
پھرتی رہی تڑپتی ہی عالم میں جا بجا	دیکھا نہ میری آہ نے روئے اثر کہیں
مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کئے	جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھکر کہیں
یوں تو نظر پڑے ہیں تن انگار اور بھی	دلریش کوئی آپ سا دیکھا نہ پر کہیں
ظالم جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو ولے	پچتاوے پھر تو آپ ہی ایسا نہ کر کہیں
پھرتے ہو سج بنائے تو اپنی جدھر تدھر
لگ جائے دیکھیو نہ کسی کی نظر کہیں

---

(۱) سج بنائے۔ یعنی سج دھج بنائے۔ سجے سجائے۔ بناؤ سنگار کئے۔

قطعہ

پوچھا میں درد سے کہ بتا تو سہی مجھے	اے خانماں خراب ہے تیرا بھی گھر کہیں
کہنے لگا مکان معین فقیر کو	لازم ہے کیا کہ ایک ہی جاگہہ ہو ہر کہیں

تونے سنا نہیں ہے یہ مصرع مگر کہیں درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائی اوست

بے زبان ہے بدہ زبان سوسن (۱) اس چمن میں کہاں مجال سخن
یاوری دیکھئے نصیبوں کی دوست بھی ہو گئے مرے دشمن
ساقی اس وقت کو غنیمت جان پھر تو میں ہوں نہ تو نہ یہ گلشن
وہ ز خود رفتہ ہوں کہ میرے تئیں (۲) نہ خیال سفر نہ یادِ وطن
کیا کہوں اپنی میں سیہ بختی حالِ دل تجھ پہ ہووے گا روشن
بعد مدت کے درد کل مجھ کو مل گیا راہ میں وہ غنچہ دہن
میری اس کی جو لڑ گئیں آنکھیں ہو گئے آنکھوں ہی میں دو دو بچن

---

(۱) گل سوسن کو زبان سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ سوسن باوجود دس دس زبانوں یعنی بہت سی زبانوں کے خموش ہے کچھ کہتی نہیں۔ اسی طرح گلشنِ روزگار میں حکم زبان بندی عام ہے۔

(۲) اس شعر میں سفر سے مراد دنیا اور وطن سے مدعا ابدالآباد ہے۔

باغِ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں (۱) گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں
دریائے معرفت کے دیکھا تو ہم ہیں ساحل (۲) گر وار ہیں تو ہم ہیں در پار ہیں تو ہم ہیں
وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے وگر قدر مجبور ہیں تو ہم ہیں مختار ہیں تو ہم ہیں
تیرا ہی حسن جگ میں ہر چند موجزن ہے تس پر بھی تشنہ کام دیدار ہیں تو ہم ہیں
الفاظ خلق ہم بن سب مہملات سے تھے (۳) معنی کی طرح ربطِ گفتار ہیں تو ہم ہیں
اوروں سے تو گرانی یک لخت اٹھ گئی ہے
اے درد اپنے دل کے گر بار ہیں تو ہم ہیں

(۱) گلشن ہستی کا وجود انسان پر مبنی ہے۔ باغِ جہاں کی رونق اس کے دم قدم سے ہے۔ اب خواہ اُسے گل سمجھو، یا خار۔

(۲) دریائے معرفت کے شناور ہم ہیں۔ اس بحرِ بیکراں کو محیط ہم نے کیا۔ ہم اس کے کنارہ ہیں۔ کنارہ دریا کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ عشقِ خدا کا بیڑہ ہم نے اُٹھایا۔

(۳) عالم امکان سے ہر شے میں ارتباط پیدا کرنے کا سہرہ حضرت انسان ہی کے سر ہے۔ موجودات عالم کو ایک سلسلے میں منسلک دستِ آدم ہی نے کیا۔

جمع میں افرادِ عالم ایک ہیں (۱) گل کے سب اوراق بر ہم ایک ہیں
ہو وے کب وحدت میں کثرت سے خلل (۲) جسم وجاں گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں
نوعِ انساں کی بزرگی سے ٹک ایک (۳) حضرتِ جبریل محرم ایک ہیں
دال ہے اس پر بھی قرآں کا نزول (۴) بات کی فہمید میں ہم ایک ہیں

متفق آپس میں ہیں اہلِ شہود
(۵) دو آنکھیں دیکھ با ہم ایک ہیں

---

(۱) جزو و کل کے مسئلے کو شاعر مثال دے کر سمجھاتا ہے۔ کہتا ہے کہ پھول کو دیکھ لو۔ ہر پنکھڑی اپنی جگہ الگ الگ ہے۔ لیکن سب مل کر ایک پھول بناتی ہے۔

(۲) اُسی مسئلے کو پھر لیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہستئ انسانی کی طرف نظر ڈالو۔ جسم و جان دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن ان دونوں سے مل کر

آدمی یا انسان بنتا ہے۔

(۳) حضرت جبرائیل پیغمبر آخرالزماں اور خدا کے درمیان پیغامبر تھے عبد اور معبود عاشق و معشوق میں پیامی۔ اُن پر مرتبۂ محبوبِ خدا منکشف ہے اور محبوبِ خدا ایک انسان تھے۔ پس مرتبۂ انسانی کی بلندیوں سے وہ کماحقہٗ واقف ہیں۔ نیز معراج میں جبرائیل امین جہاں نہ جا سکے تھے۔ اور کہا تھا "بسوزد پرم" وہاں رسول اللہؐ گئے۔

(۴) کلام اللہ انسان پر نازل ہوا۔ یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے سمجھنے کا اہل اسی خاکی کو سمجھا گیا۔

(۵) اہلِ بینش و اہلِ نظر کبھی تفرقہ میں نہیں پڑتے۔ آنکھوں کو بینائی عطا کی گئی ہے۔ جو کچھ دیکھتی ہیں مل کر دیکھتی ہیں۔ اُن میں اختلاف نہیں ہوتا۔ نیز خود دو ہونے کے باوجود چیز کو ایک ہی دیکھتی ہیں۔

نہ ہم کچھ آپ طلب نے تلاش کرتے ہیں | جو کچھ کہ یاں ہے مقدر معاش کرتے ہیں
مثالِ عکس جو کوئی کہ پاک طینت ہیں | جہاں صفا ہے وہیں بود و باش کرتے ہیں
ہماری اتنی ہی تقصیر ہے کہ اے زاہد | جو کچھ ہے دل میں ترے ہم وہ فاش کرتے ہیں
مزاجِ نازکِ دل سے اگر مکدر ہو | یہ آئینہ ہم ابھی پاش پاش کرتے ہیں

یہ تیرے شعر ہیں اے درد یا کہ نالے ہیں
جو اس طرح سے دلوں کو خراش کرتے ہیں

---

(۱) مصرعے کو موزوں پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ "نازک" اور "دل" کے درمیان اضافت لگائی جائے اور مصرعہ کو اس طرح پڑھا جائے کہ

"مزاج نازکِ دل سے اگر مکدر ہو" یہاں "نازکِ دل" کے معنی نازکی، یا نزاکتِ دل کے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر جناب کی طبیعت پر میرے دل کی نزاکت گراں ہے۔ اور باعثِ تکدر و غبار تو ہم شیشۂ دل کو ابھی پاش پاش کر دینگے۔ ہم کو آپ عزیز ہیں، دل عزیز نہیں۔ نیز مصرعۂ اولیٰ کو اگر قدرے ردو بدل کر کے یوں پڑھیں کہ "ترا مزاج مرے دل سے گر مکدر ہو" تو یہی معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن بہتر ہوتا اگر کسی طرح نازک کی صفت مزاجِ یار کے ساتھ گی جاتی بہر کیف جو پہلو نظر آئے عرض کر دئے گئے۔

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں ۔۔۔ جان سے اپنی جو کوئی کہ گذر جاتے ہیں

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے ۔۔۔ مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

دید وا دید جو ہو جائے غنیمت سمجھو ۔۔۔ جوں شرر ورنہ ہم اے اہلِ نظر جاتے ہیں

آنکھیں اس بزم میں سینکی ہیں جنھوں نے ٹک بھی (۱) ۔۔۔ شمع کی طرح گریباں لئے تر جاتے ہیں

بے ہنر دشمنیٔ اہل ہنر سے آ کر ۔۔۔ منہ پہ چڑھتے تو ہیں پر دل سے اتر جاتے ہیں

ہم کسی راہ سے واقف نہیں جوں نورِ بصر (۲) ۔۔۔ رہنما تو ہی تو ہوتا ہے جدھر جاتے ہیں

اے رگِ ابر یہ مژگاں بھی اگر ٹک برسیں ۔۔۔ ایک پل میں کئی تالاب تو بھر جاتے ہیں

آہ معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز ۔۔۔ لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالم سے
درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

---

(۱) محاورے میں آنکھیں سینکنا، حسینوں کو دیکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں جس کسی نے بھی گلرخوں کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا

اُسے خارِ فرقت سے پالا پڑا۔ جس نے بھی آنکھیں سینکیں اُسے رونا پڑا شمع کی آنکھ گرم ہوتی ہے۔ نیز اشک افشاں بھی اس وجہ سے اُس پر آنکھیں سینکنے اور تر گریبانی دونوں کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

(۲) وہی ایک ذاتِ واحد ہر سالک کے لئے خضرِ راہ ہے۔

نفس عیسوی چراغ ہوں میں	(۱) اپنی قسمت کے ہاتھوں داغ ہوں میں
رفتگاں کا مگر سراغ ہوں میں	(۲) ہوں فتادہ برنگ نقشِ قدم
آگ میں ہوں پہ باغ باغ ہوں میں	(۳) میں ہوں گلچیں گلستانِ خلیل

عین کثرت میں دید وحدت ہے
قید میں درد با فراغ ہوں میں

---

(۱) شاعر اپنے کو چراغ سے مشابہ بتاتا ہے اور وجہ شبہہ جسم کے داغ قرار دیتا ہے۔ اے دمِ عیسےٰ میں اپنی سیہ بختی کے ہاتھوں سے سرتاپا داغدار ہوں۔ چرکے کھائے ہوئے ہوں۔ ذرا اس کا خیال رہے کہ میں سوختہ ساماں چراغ کی مانند ہوں۔ نفس عیسوی گو مردوں کو جلاتا اور بیماروں کو شفا بخشتا تھا۔ لیکن چراغ کے لئے وہ بھی باعثِ ہلاکت تھا۔ چونکہ عاشق اور چراغ میں داغوں کی وجہ شبہہ موجود ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں عاشق کے لئے دمِ عیسیٰ بھی نہ صرف فائدہ مند اور حیات بخش نہیں بلکہ گزند رساں اور باعث ہلاکت ہوسکتا ہے۔

(۲) خاک نشین ہوں والے خضرِ راہ۔ افتادہ ہوں مگر راہ نما میری مثال نقشِ پا کی سی ہے۔ جو خود خاک پر پڑا رہتا ہے۔ لیکن پیش رفتگان کا پتہ

دیتا ہے اور آنے والوں کو راہ بتاتا ہے۔

(۳) باغ باغ ہونا۔ یعنی خوش ہونا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بحالتِ سوز و گداز بھی خوش ہوں۔ چونکہ اس مذہب کا پیرو ہوں جس کی بنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے ڈالی تھی صنعت تلمیح ہے۔ اشارہ آتشِ نمرود اور اس کے گلزار ہو جانے کی طرف ہے۔

(۴) عالم کثرت میں بھی دیدار کن وحدت ہوں۔ دُنیائے محدود میں اس ذات لامحدود کا تماشائی اس قید آب و گل میں بھی میرا دل و دماغ آزاد ہے۔

مرتا نہیں ہوں کچھ میں اس سخت دل کے ہاتھوں
پستا ہوں آپ اپنے کمبخت دل کے ہاتھوں

نالاں نہیں ہے تنہا اس راہ میں جرس تو (۱)
روتے گئے ہیں کتنے یک لخت دل کے ہاتھوں

ہمت رفیق ہووے تو فقر سلطنت ہے
آتا ہے ہاتھ یعنی یاں تخت دل کے ہاتھوں

اے غنچہ تجھ سے آگے جو کچھ کہ تھا گرہ میں (۲)
کل یاں مٹا گئے ہیں گل رخت دل کے ہاتھوں

اے درد آہ پھر پھر آتا ہی ہے جی میں
پستا ہوں آپ اپنے کمبخت دل کے ہاتھوں

---

(۱) شاعر جرس سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ ایک صرف تو ہی اس صراطِ حیات میں نالہ کناں نہیں۔ اور بھی بہت سے اس دل کے ہاتھوں روتے گئے ہیں۔

(۲) اے غنچہ تجھ سے پہلے بہت سے گل اپنا تمام متاع لٹا گئے ہیں۔ شعر صاف ہے۔ صرف الفاظ کی نشست دھوکے میں ڈالتی ہے۔ اگر اس طرح پڑھیں تو صاف ہو جائے گا۔ اے غنچہ تجھ سے پیشتر گلوں کی گرہ

میں جو کچھ بھی رخنت تھا وہ کل یہاں دل کے ہاتھوں لٹا گئے "گل" اور "یاں" کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو گلی کی جمع کا شبہہ ہوتا ہے۔

---

(۱) جھاڑمت خاک پہ میری یہ غبار دامن
جی نہ اٹھوں کہیں پھر میں جو تو مارے دامن
خون عاشق بھی کہیں ہووے بہار دامن
دامنِ دشت ہے پُر لالہ و گل سے یارب
ہر گھڑی کھینچ نہ بے رحم کنارِ دامن
ہم کہ دامن سے لگے ہیں نہ کہیں چھٹ جاویں
(۲) ہے وہی "تارِ گریباں" وہی "تارِ دامن"
تار باندھا ہے مرے اشک نے یاں تک جوں شمع
ہنس کے رکھتا میری گردن پہ ہی بار دامن
جب وہ چاہے ہے کہ دامن کو اٹھا کر چلیے
(۳) خار یا ہو ویں کسو کے نہ یہ خارِ دامن
فرش رہ آنکھیں تو کیں میں نے پہ میرے مژگاں
درد تو کون ہے جو گرد جھٹکنے پاوے
دُور دامن سے ہے ترا صدقے نثارِ دامن

---

(۱) دامن جھاڑ کر اٹھنے کے معنی محاورے میں دست بردار ہونے تعلق توڑ دینے کے ہوتے ہیں۔ سو اگر معشوق عاشق کی قبر سے دامن جھاڑ کر اٹھا تو اس کا مطلب ہوا کہ تعلقات منقطع کر دئے اور یہ عاشق کو کسی عنوان گوارا نہیں۔ پس اس فعل سے روکنا چاہتا ہے۔ اور وجہ یہ بتاتا ہے کہ کہیں یہ حرکت میرے احیا کا باعث نہ بن جائے۔ اس لئے کہ معشوق کے دامن کی ہوا عاشق کے لئے دمِ عیسوی سے کم نہیں۔ نیز دامن جھاڑنے اور دامن مارنے میں ہوا کو حرکت ہونی لازمی۔

(۲) شمع کے آنسو لڑی بند ہوتے ہیں اوپر سے نیچے تک تار ہی تار نظر آتے ہیں۔ شاعر اپنی آشفتہ حالی اور وریدگی کو شمع سے مثال دیتے ہوئے

کہتا ہے۔ کہ اب تارِ گریباں اور تارِ داماں میں کچھ فرق نہ رہا۔ غالبؔ نے کہا ہے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(۳) میں نے اپنی پلکیں فرشِ راہ تو کر دی ہیں۔ ولے یہ فکر ہے کہ کہیں یہ کسی کے پاؤں میں نہ چبھیں ور کسی کے دامن سے نہ الجھیں۔

(۴) اے درد معشوق کے قریب تیرا گذر نہیں ہو سکتا۔ اس کے گرد تو دامن اور دورِ دامن صدقہ اور نثار ہوتے جا رہے ہیں۔

(ان معنی سے راقم مطمئن نہیں ہے۔ بہر نوع جو تھوڑے بہت سمجھ میں آئے لکھ دئے گئے)۔

---

(۱) کیوں نہ ڈوبے رہیں یہ دیدۂ تر پانی میں — یاں بنا مثلِ حباب اپنا تو گھر پانی میں
اشک سے میرے فقط دامنِ صحرا نہیں تر — کوہ بھی سب ہیں کھڑے تا بہ کمر پانی میں
مردمِ دیدہ مرے اشک میں یوں رہتے ہیں — کب یہ گذران کرے اور بشر پانی میں
آتشِ مے سے جو ساقی نے اسے بھڑکایا — زاہدِ خشک ہوا خوب ہی تر پانی میں
چشمۂ آب نہ ہو چشمۂ خورشید سے کم — شعلہ رو تو کبھو منہ دیکھے اگر پانی میں
(۲) جس طرف چاہوں چلوں یاں وہ سرِ البتاں ہے — وہم کہتا ہے کہ اب پاؤں نہ دھر پانی میں

(۳)
عالم آب میں جوں آئینہ ڈوبا ہی رہا
تو بھی دامن نہ کیا درد نے تر پانی میں

---

(۱) پانی سے شاعر کی مراد دریائے معرفت ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارا تو

گھر عشق خداوندی کے بحر بیکراں میں ہے۔ پھر ہماری آنکھیں ہمہ وقت آنسوؤں میں کیوں نہ ڈوبی رہیں۔

(۲) دنیا سراپا دھوکہ ہے۔ ہر لحظہ یہ دھوکہ دامن گیر ہے کہ دام فریب معصیت میں نہ پھنس جاؤں۔

(۳) میں عالمِ معصیت میں رہ کر بھی عصیاں شعار نہ ہوا۔ دنیا میں رہا وے دامن کشیدہ جس طرح آئینہ گو آبدار ہے لیکن تر دامنی سے محفوظ۔

معلوم نہیں آنکھیں یہ کیوں پھوٹ بہی ہیں — رونے کی طرف کس لئے یہ ٹوٹ بہی ہیں

کشتی کی طرح آنکھیں مرے اشک میں یارو (۱) جس تار نگہ سے بندھی تھیں چھوٹ بہی ہیں

ہیں مثل حباب آنکھیں تو رو رو کے بہا دیں — پر وہ یہی کہتا ہے سدا جھوٹ بہی ہیں

سرسبز یہ کس جلوے سے ہوئیں آنکھیں جو آنا (۲) دریا کی طرح کھیت مرا لوٹ بہی ہیں

اے درد سمجھ ہیج نہ ان آنکھوں کا بہنا
چھاتی کے تئیں دل کو مرے کوٹ بہی ہیں

---

(۱) سیلِ اشک میری آنکھوں کو اس طرح بہا کر لے گیا جیسے کسی کشتی کی رسی ٹوٹ جائے اور وہ بہتی پھرے۔ شاعر زیادتیٔ گریہ بیان کرتا ہے۔ نیز زیادہ رونے سے آنکھیں جاتی رہتی ہیں۔

(۲) کھیت سے مراد کشتِ حیات ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسے کون سے جلوے نے میری آنکھوں کو سیراب کیا کہ دریا کی طرح میری کشت زار حیات کو بہا کر لے گیا۔

گھر تو دونوں پاس ہیں لیکن ملاقاتیں کہاں (۱) آمد و رفت آدمی کی ہے پہ وہ باتیں کہاں
ہم فقیروں کی طرف بھی تو نگاہیں دمبدم پھینکتے جاتے تھے اب اگلی سی خیراتیں کہاں
بعد مرنے کے مرے ہو گی مرے رونے کی قدر تب کہا کیجے گا لوگوں سے وہ برساتیں کہاں
یوں تو ہے دن رات میرے دل میں اس کا ہی خیال جن دنوں اپنی بغل میں تھا سو وہ راتیں کہاں

جس طرح سے کھیلتا ہے وہ دلوں کا یاں شکار
درد آتی ہیں کسی دلبر کو وہ گھاتیں کہاں

---

(۱) دونوں گھر سے مراد۔ دونوں عالم۔ آدمی کی آمد و رفت سے مراد۔ پیدا ہونا، اور مرنا۔ وہ باتوں سے مطلب پیغمبروں کا آنا۔ شاعر کہتا ہے دونوں جہان میں کچھ زیادہ فصل نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہمہ وقت لوگ آجا رہے ہیں۔ یعنی پیدا ہو رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔ لیکن اس عالم اور اُس عالم میں جو پہلے ارتباط تھا۔ وہ نہ رہا۔ مطلب یہ کہ انسان تو آتے جاتے ہیں لیکن پیغام سلام نہیں۔ یعنی پیغمبر آخر الزماں کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

مجھے در سے اپنے تو ٹالے ہے یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں (۱)
کوئی اور بھی ہے ترے سوا تو اگر نہیں تو جہاں نہیں
پڑی جس طرف کو نگاہ یاں نظر آ گیا ہے خدا ہی واں (۲)
یہ ہیں گو کہ آنکھوں کی پتلیاں مرے دل میں جائے بتاں نہیں
مرے دل کے شیشے کو بے وفا تو نے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیا
مرے پاس تو وہی ایک تھا یہ دکان شیشہ گراں نہیں

مجھے رات ساری ہی تیرے یاں کٹے کیونکہ نہ روتے شمع ساں
کہ نہ ہو سکے ہے کچھ اب بیاں یہ وہ بات ہے کہ زباں نہیں

کوئی سمجھے کیونکہ یہ مدعا کہ پہیلی سا ہے یہ ماجرا
کہا میں تجھے نہیں جاہ کیا لگا کہنے مجھ سے کہ ہاں نہیں

نہ ملا ہمیں کوئی نکتہ داں یہ بیت سناویں بھلا کہاں (۳)
نہ ہوا سبھوں پہ وہی عیاں جو کسی سے یاں تو نہاں نہیں

تجھے درد کیونکہ سناؤں میں نہ خدا کسی کو دکھاوے یہ
جو کچھ اپنے جی پہ گذرتی ہے کہوں کیا کہ اس کا بیاں نہیں

---

(۱) قیام عالمِ ہست وبود اُس ذات واحد کی وجہ سے ہے اگر وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں جب دنیا میں اُس کے سوا کچھ بھی نہیں تو پھر انسان کا ملجا و ماویٰ اس کے سوا کون ہو سکتا ہے کسی نے کہا ہے۔

جز آستانِ توام درجہاں پناہے نیست
سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

(۲) آنکھ کی پتلی محاورے میں عزیز اور محبوب ہستی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بُت گو آنکھ کی پتلی ہیں۔ مجھے زیادہ سے زیادہ عزیز ہیں۔ لیکن خدا خدا ہی ہے۔ اس کے مقام تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ دل خانۂ خدا ہے وہاں اُن کے لئے جگہ نہیں۔ نیز پتلی اور بت کا ساتھ استعمال حسنِ کلام ہے۔

(۳) حلقۂ عارفان میں جو امر سب پر منکشف ہے وہ اس دائرے کے باہر راز سربستہ ہے۔

دل کو لے جاتی ہیں معشوقوں کی خوش اسلوبیاں
ورنہ ہیں معلوم ہم کو سب انھوں کی خوبیاں

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حورِ بہشت
پر کہاں یہ شوخیاں یہ طور یہ محبوبیاں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

آپ تو تھی ہی پر اس کا بھی کیا خانہ خراب
درد اپنے ساتھ آنکھیں دل کو بھی لے ڈوبیاں

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلا کرتا نہیں
(۱) دل میں ہر وہ ہی وفا پر جی وفا کرتا نہیں

سعی بے جا مت کر و مہر و وفا وہ شوخ تو
جی کو ان باتوں سے ہر گز آشنا کرتا نہیں

کونسی شب ہے کہ مثلِ شمع جب کھلتی ہے آنکھ
(۲) جائے اشک آنکھوں سے اپنے خوں گرا کرتا نہیں

عشوہ و ناز و کرشمہ ہیں سبھی جاں بخش لیک
درد مرتا ہے کوئی اس کی دوا کرتا نہیں

---

(۱) جی کا وفا نہ کرنا یعنی زندگی کا ساتھ نہ دینا۔ شاعر کہتا ہے کہ دمِ آخر بھی میرے لب پر تیرا شکوہ نہیں۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ دل عہدِ وفا نہیں بھولا ہے زندگی نے وفا نہ کی اس لئے مجبور ہو گیا۔

(۲) شمع کی آنکھ کھلنا اس کے روشن ہونے کے مترادف ہے۔ اور روشن ہوتے ہی بوندیں جو آنسوؤں سے مشابہ ہوتی ہیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

پڑے جوں سایہ ہم تجھ بن ادھر اُدھر بھٹکتے ہیں
جہاں چاہیں قدم رکھیں تو پہلے سر پٹکتے ہیں

بتا وہ کون ہے جو تیری مجلس میں نہیں ہوتا
مگر یہ ایک ہم ہی ہیں کہ نظروں میں کھٹکتے ہیں

نہیں معلوم کیا ہوگا یہ دل اس زلف میں الجھا
جہاں اے درد الیسے تو ہزاروں ہی لٹکتے ہیں

ہجر یار میں اپنی شوریدہ سری کی مثال سائے سے دیتا ہے. سایہ زمین پر سر کے بل گرتا ہوا معلوم ہوتا ہے. شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی تیرے بغیر اسی طرح سر پٹختے پھرتے ہیں. جس طرح سایہ اصل سے جدا ہو کر۔

آہ پردہ تو کوئی مانع دیدار نہیں (۱) اپنی غفلت کے سوا کچھ در و دیوار نہیں
ہم سے دل مردہ اگر راتکو جاگے تو کیا (۲) چشم بیدار تو ہے پر دلِ بیدار نہیں
درد یاں دو ہی پیالوں پہ قناعت کیجے
خانۂ چشم ہے یہ خانۂ خمار نہیں

---

(۱) کوئی پردہ تو عاشق و معشوق کے درمیان حائل ہو نہیں سکتا. یہ ہماری اپنی غفلت ہے جس نے اس کو ہم سے اوجھل کر رکھا ہے۔
(۲) چلہ کشی اور شب بیداری سے کچھ حاصل نہیں، صفائے قلب درکار ہے۔

اے ہجر کوئی شب نہیں جس کو سحر نہیں پر صبح ہوتی آج تو آتی نظر نہیں
دل لے گیا پر ایک نہ کی اس طرف نگاہ ایسا تو دلبروں میں کوئی مفت بر نہیں
کہہ کونسا ہے دامنِ صحرا جہان میں
اے درد آنسوؤں سے جو تیرے وہ تر نہیں

مرے ہاتھوں کے ہاتھوں اے عزیزاں گریباں چاک ہے چاکِ گریباں
کھلا ہے بابِ عرفاں جس کے اوپر (۱) اُسے ہے ہر ورقِ گل کا گلستاں

صبا جاتا ہوں گریاں میں چمن سے گلوں کو باغ میں رکھیو تو خنداں

(۱) اہلِ عرفاں جزو کل کو مشاہدہ کرتے ہیں۔

گرچہ ہم مردہ دل اے جانِ جہاں جیتے ہیں تجھ بن اے وائے جو سمجھے تو کہاں جیتے ہیں
زندگی جس سے عبارت ہے سو وہ زیست کہاں یوں تو کہنے کے تئیں کہیئے کہ ہاں جیتے ہیں
بعد مرنے کے بھی وہ بات نہیں آتی نظر (۱) جس توقع پہ کہ ہم اب تئیں یاں جیتے ہیں

(۱) جس تمنا میں ہم آج تک جی رہے ہیں وہ بعد مرگ بھی پوری ہوتی نہیں نظر آتی۔ وہ تمنا ہے وعدۂ دیدارِ خداوندی جو صرف جنتیوں کے لئے ہے۔ یہ آخری شرط ہے جو خواجہ میر درد کو مایوس کر رہی ہے

دل تو سمجھانے سمجھتا بھی نہیں کہیئے سودائی، تو سودا بھی نہیں
اس کی باتیں مجھ سے کیا پوچھو ہو تم مدتیں گذریں کہ دیکھا بھی نہیں
داد کو تو پہونچنا معلوم ہے (۱) کوئی یاں فریاد سنتا بھی نہیں

میں تو سب باتیں نصیحت کی کہیں پر اثر ہوتا ہے دل کے تئیں کہیں

جس کے بن دیکھے نہ نیند آتی ہمیں خواب میں بھی دیکھتے اس کو نہیں
صورتیں کیا کیا ملی ہیں خاک میں (۲) ہے دفینہ حسن کا زیرِ زمیں

(۱) جہاں فریاد تک نہ سنی جائے وہاں انصاف کیا۔

(۲) غالب کا ہم معنی شعر ملاحظہ ہو۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

رباعیات

آگے ہی بن سنے تو کہے ہے نہیں نہیں
تجھ سے ابھی تو ہم نے وہ باتیں کہیں نہیں
ہیں معنئ بلند مرے عرش سے پرے
مت کہہ کہ بات درد کی کرسی نشیں نہیں

دو نگاہیں جو چار ہوتی ہیں
برچھیاں ہیں کہ پار ہوتی ہیں
بیوفائی پہ اس کی دل مت جا
ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

اگر میں نکتہ رسی سے ترا وہاں پاؤں
کمر کو چاہوں تو اُس کے تئیں کہاں پاؤں
یہ رات شمع سے کہتا تھا درد پروانہ
کہ حالِ دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں (۱)

---

(۱) جان کی اماں پاؤں۔ یہ فقرہ کہانیوں میں سننے میں آتا ہے۔ سرِ دربار و روبروئے شاہ جب کوئی بات شرح و بسط کے ساتھ کہنی ہوتی تھی اور اس میں سوٗ ادب کا اندیشہ ہوتا۔ تو کہنے والا پہلے کہتا۔ جان کی اماں پاؤں تو زبان پر لاؤں۔ شاہ کی جانب سے ارشاد ہوتا "تیری جان۔ تجھے مبارک جو کہنا ہے سو کہہ"

دل میں رہتے ہو پر آنکھوں دیکھنا مقدور نہیں
گھر سے دروازہ تلک آؤ تو چنداں دور نہیں (۱)

چاہئے دونوں جہاں جل جاویں اک شعلے کے ساتھ
درد ایسی سرد آہیں عشق میں منظور نہیں (۲)

---

(۱) دل گھر ہے اور آنکھیں اُس کا دروازہ جب تم گھر میں موجود ہو تو پھر آنکھوں تک کیوں نہیں آجاتے کہ جب دل میں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو۔

(۲) عشق میں ایسا نالۂ سوزاں درکار ہے جو بیک نفس دونوں عالم کو پھونکدے۔ یہاں ان سرد آہوں سے کام نہیں چلے گا۔

زلفوں میں تو سدا سے یہ کج ادائیاں ہیں
آنکھوں نے پر یہ اور ہی آنکھیں دکھائیاں ہیں

ہے اپنے جی میں جو کچھ تم جانو یا نہ جانو
پر سب تمھاری باتیں اب ہمنے پائیاں ہیں

سیر گرد دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

دیکھ میرے ضعف کو کہنے لگا رو کر طبیب
کوئی دم کو یہ بھی اس کی ناتوانی پھر کہاں

کب دہن میں ترے سمائے سخن
نہیں میرے دہن میں جائے سخن

شعر میرے میں دیکھنا مجھ کو
ہے مرا آئینہ صفائے سخن

کہیں ہوئے ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
یہ بے سبب نہیں ہم سے حجاب آنکھوں میں

کرے ہے مست نگاہوں میں ایک عالم کو ۔۔۔ لئے پھرے ہے یہ ساقی شرابِ آنکھوں میں

---

(۱) اگر اس شعر کو حقیقت کی طرف لے جاؤ تو اشارہ اَلَستُ بِرَبِّکُم کی طرف ہے۔ اور حجاب سے مراد حجاباتِ عالمِ تکوین ہیں۔

ہردم بتوں کی صورت رکھتا ہی دل نظر میں ۔۔۔ ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں
ایسا ہی غم نے تیرے پامال کردیا ہے (۱) ۔۔۔ کچھ دل رہا نہ دل میں نہ کچھ جگر جگر میں

---

(۱) دل میں دل نہ رہنا اور جگر میں جگر نہ رہنا۔ محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں سکت نہ رہنا۔ طاقت نہ رہنا۔ ہمت ٹوٹ جانا۔

افراد

اس ذکر سے بھی مجھ کو کیا کام دل کے ہاتھوں ۔۔۔ لیتا نہیں کسو کا میں نام دل کے ہاتھوں

نہیں ہم کو تمنا یہ ملک ہوتا فلک پہونچیں ۔۔۔ یہی ہے آرزو دل کی ترے قدموں تلک پہونچیں

نزع میں ہوں پہ ہی نالے کئے جاتا ہوں ۔۔۔ مرتے مرتے بھی ترے غم کو لئے جاتا ہوں

افسوس اہلِ دید کو گلشن میں جا نہیں ۔۔۔ نرگس کی گو کہ آنکھیں ہیں پر سوجھتا نہیں

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں اہل بصیرت کے لئے گنجائش نہیں اس

دعوے کو نرگس کی مثال دے کر ثابت کرتا ہے کہ اُسے گلشن میں اس وقت جگہ ملی جب کہ آنکھ تھی وے بینا نہیں۔

شیخ ہیں رشکِ بے گناہی ہوں   مورد رحمتِ الٰہی ہوں

رحمتِ حق تو گناہگاروں ہی کے لئے ہے۔ بے گناہ اس سے محروم ہیں۔ اس وجہ سے بے گناہی ہم پر حق بجانب رشک کرتی ہے۔

ردیف الواؤ

مانع نہیں ہم وہ بتِ خود کام کہیں ہو   پر اس دلِ بیتاب کو آرام نہیں ہو
خورشید کے مانند پھروں کب تئیں یارب   نت صبح کہیں ہووے مجھے شام کہیں ہو
میخانۂ عالم ہے وہ بے ربط کہ جس میں   ہووے جو صراحی کہیں تو جام کہیں ہو
وعدے تو مرے ساتھ کئے تو نے ہزاروں   پر ایک بھی اُنہوں میں سرانجام کہیں ہو
ہر چند نہیں صبر تجھے دردؔ و لیکن
اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو   (۱) کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو
ہووے نہ حول و قوت اگر تیری درمیاں   (۲) جو تجھ سے ہو سکے ہے سو ہم سے کبھو نہ ہو
جو کچھ کہ ہم نے کی ہے تمنا ملے مگر   (۳) یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو
جوں شمع جمع ہو دیں گر اہلِ زباں ہزار   (۴) آپس میں چاہئے کہ کبھی گفتگو نہ ہو

جوں صبح چاک سینہ مرا اے رفوگراں — یاں تو کسو کے ہاتھ بھی ہرگز رفو نہ ہو

اے درد زنگِ صورت اگر اس میں جا کرے

اہلِ صفا میں آئینۂ دل کو رو نہ ہو (۵)

---

(۱) تقریباً ہم معنی شعر ملاحظہ ہو۔

بشکند دستے کہ خم درگردنے یار نشد — کور بہ چشمے کہ لذّت گیر دیدار نشد

(۲) اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو تین مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے (۱) ع "جو تم سے ہو سکے ہے سو ہم سے کبھو نہ ہو۔ اگر اس تم کی ضمیر فرشتوں اور کروبیوں کی طرف راجع کریں تو شعر کے معنی مندرجہ ذیل ہوتے ہیں۔ اصل عبادت اعتراف عبدیت ہے اور فرشتہ ہمہ وقت صرفِ عبادت رہتے ہیں۔ اپنے عبد ہونے کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں۔ انسان سرکش سے یہ امر محال تھا۔ اگر قوت خداوندی کا تصرف و خوف کارفرما نہ ہوتا (۲) نیز اس مصرعہ کو یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ع جو تجھ سے ہو سکے ہے سو ہم سے کبھو نہ ہو۔ اس طرح تجھ کی طرف راجع ہو سکتی ہے اور شعر کے معنی یوں کئے جا سکتے ہیں کہ اگر توفیق خدا شامل حال نہ ہو تو انسان مظہرِ صفات خداوندی نہ ہو سکے۔ (۳) اور اگر اس مصرعہ کو یوں پڑھیں ع جو ہم سے ہو سکے ہے سو ہم سے کبھو نہ ہو تو معنی اس طرح کئے جائیں گے کہ انسان مجبور ہے اور تو قادر تیری ذات سب کچھ کر رہی ہے، ہماری حیثیت کٹ پتلیوں سے زیادہ نہیں۔

(۳) مانا کہ ہماری تمام و کمال آرزوئیں پوری ہو جائیں تاہم اپنی تو یہ آرزو تھی کہ ہم آرزو ہی سے بے نیاز و مستغنی ہوں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم تمام آرزوئیں پوری ہو جانے پر بھی آرزومند ہیں۔

(۴) شمع کی لو کو زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن خموش۔ شاعر مثال دے کر خموشی کی تلقین کر رہا ہے۔ لفظ ہزار بھی لطف سے خالی نہیں۔ چونکہ بلبل کے واسطے مستعمل ہوتا ہے۔

(۵) اگر آئینۂ دل تعلقات دنیوی سے آلودہ ہوجائے یا غبارِ خواہشات اس پر بیٹھ جائے تو پھر یہ صحبت اہل صفا کے لائق نہیں رہتا۔ زنگِ صورت، دو معنی دے سکتا ہے۔ ایک تو عالم صورت۔ دوسرے ظاہر پرستی و ریاکاری۔

---

(۱) شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو — سمجھنا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو

(۲) چھڑائے آہ کوئی کیونکہ زنگی سے سیاہی کو — نہیں ممکن کہ ہم سے ظلمتِ امکان زائل ہو

اُدھر سے نیستی آتی ہے دوڑی عذر خواہی کو — عجب عالم ہے ایدھر سے ہمیں ہستی ستاتی ہے

گنہگاروں میں سمجھا کر تو اپنی بے گناہی کو — نہ رہ جاوے کہیں تو زاہدا محروم رحمت سے

(۳) نہ لازم نیستی اُس کو نہ ہستی ہی ضروری ہے
بیاں کیا کیجئے اے درد ممکن کی تباہی کو

---

(۱) اگر تو عالم اسفل کی مدد سے عالم اعلیٰ کو سمجھنا چاہے۔ اگر تو دنیا کو دیکھ کر عقبیٰ کا ادراک کرنا چاہے تو عالمِ شہود یعنی دُنیا عالم غیب یعنی عقبیٰ کے لئے ہمہ وقت گواہی دینے کو حاضر ہے۔ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ اگر انسان اس عالمِ فانی کو بہ نظرِ غایت دیکھے تو اس کو نظر آجائے گا کہ اس کے پسِ پردہ ایک عالمِ لافانی بھی ہے۔

(۲) ظلمت امکان۔ یعنی عالمِ امکان سے متعلق ہونے کی تیرگی۔ دنیوی ہونے کی سیاہی۔

(۳) عالمِ امکان یعنی دنیا کا شمار نہ نیست میں ہے نہ ہست میں۔ نہ اِدھر ہے، نہ اُدھر۔ دُنیا کو نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہے۔ چونکہ عکس کی حقیقت ہی کچھ نہیں۔ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ گو عکس سہی۔ لیکن نظر تو آتا ہے اُسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

مجلس میں بار ہووے نہ شمع و چراغ کو　　لاویں اگر ہم اپنے دلِ داغ داغ کو

جاتی تو ہے تو زلف کے کوچہ کو اے صبا　　پر دیکھیو جو چھیڑے کسی بے دماغ کو

بس بارِ دل زیادہ نہ ہو حسرتِ چمن　　کیدھر لئے پھروں گا میں گلگشتِ باغ کو

بلبل کی طرح رشتۂ الفت میں دیکھ دل　　بندھوا نہ دیجیو کہیں باغِ فراغ کو

کیا چھپ رہی ہے پردۂ مینا میں دُختِ رز (۱)　　روشن کر اپنے جلوے سے چشمِ ایاغ کو

تمیز بے تمیزیٔ عالم کرے سے ہے کب　　نالے سے عندلیب کے یاں بانگ زاغ کو

اے درد رفتہ رفتہ کیا آپ کو بھی گم
اس راہ میں چلا تھا میں اس کے سراغ کو

---

(۱) شاعر مئے معرفت سے کہتا ہے۔ بس اب تو تو اکبار حجابات اُٹھاوے۔

مست ہوں پیرِ مغاں کیا مجھ کو فرماتا ہے تو　　پائے بوسِ خم کروں یا دست بوسی سبُو

صبح اور خورشید کی مانند میری جیب کو (۱)　　چاک کا موجب ہے تو ہی تو ہی اسبابِ رفو

ٹال دیتا اُس کو مت ہر طرح جوں قبلہ نما (۲)　　پھر مجھے ہر پھر کے آ رہنا اُسی کے روبرو

اور افزونی طلب کی بعد مرنے کے ہوئی　　خاک ہونے نے کیا ہر ذرہ گرمِ جستجو

تیری خوں آشامیاں مشہور ہیں اے تیغِ ناز (۳)　　ایک قطرہ چھوڑے تو ہووے ہمارا ہی لہو

جس طرح سے صبح کو ہوتا ہے بے رونق چراغ　　دیکھ تجھ کو اڑ گیا گلشن میں گل کا رنگ و بو

(۴) سر اگر کاٹے انھوں کا محتسب مثل کدو　　اور ہوں آمادۂ میخوارگی یہ مے پرست

(۵) نت زبانِ شمع کو بھی چشم سے ہے گفتگو　　بات اہل دید سے کرتے ہیں یاں روشن ضمیر

صورتِ تقلید میں کب معنیٔ تحقیق ہیں　　رنگ گو ہے پر گل تصویر میں کیدھر ہے بو

(۶) سینکڑوں ہیں تخم سے اس باغ میں نکلے نہال
تخم دل کی بر نہ آئی درد لیکن آرزو

---

(۱) عشق خدا ہی تڑپاتا ہے اور وہی وجہِ تسکین۔ اس مسئلے کو شاعر مثال دے کر واضح کرتا ہے۔ کہتا ہے دامانِ صبح خورشید چاک کر کے نکلتا ہے۔ اور اس ہی کے آگے کی منازل میں پہنچ جانے سے وہ پھر ایک ہو جاتا ہے۔ جڑ جاتا ہے جیسے کسی رفوگر نے رفو کر دیا ہو۔ پس اس ہی طرح تیرا عشق مرض بھی ہے مداوا بھی۔

(۲) قبلہ نما کی سوئی کا رُخ قبلہ سے پھیر دیجے پھر تڑپ تڑپا کر اس ہی طرف آجاتی ہے یہی کیفیت میری ہے۔ تیرے ہجر میں بے چین رہتا ہوں اور تیرے سامنے آکر قرار لیتا ہوں۔

(۳) ہمارا لہو پیے، زبان میں قسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی کام کی تاکید کرنی ہوتی ہے۔ تو کہتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کرو تو ہمارا لہو پیو۔ شاعر تیغِ یار کو خون آشامی کی دعوت دے کر تاکیداً قسم دے رہا ہے۔

(۴) کدو کو ایک طرف سے کاٹ کر کھوکھلا کر لیتے تھے۔ پھر اس میں شراب بھر کر رکھتے تھے۔ اُس میں دو فائدے مدنظر تھے۔ ایک تو یہ کہ کدو کا مزاج سرد ہے وہ شراب کی حدّت کو قدرے کم کر دیتا تھا۔ نیز اس کی

سمیت کو ایک حد تک زائل کر دیتا تھا اور وہ مُدبّر ہو جاتی تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ میخواروں سے صحبتِ دخترِ رز چھڑائی نہیں جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ جو محتسب سزا دے سکتا ہے۔ وہ سر کاٹ دینا ہے۔ سو کدو کو دیکھ لو اُسے یہ چسکا پڑا ہے، سر کٹ جانے پر اور بھی زیادہ پینے لگتا ہے۔

(۵) شمع کی لو سے آنکھ مستفید ہوتی ہے۔ بعینہٖ اہلِ دل اُن ہی کی طرف توجہ کرتے ہیں جن کے پاس دیدۂ بینا پاتے ہیں۔

(۶) بیج پھٹتا ہے اور اس کے اندر سے پودا برآمد ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ بیج کے دل میں جو شے تھی وہ باہر نکل آئی۔ اور دل میں آرزو ہوتی ہے۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ ہر تخم کی آرزو برآئی لیکن دل وہ تخم تھا جس کے دل کی دل ہی میں رہی۔

ملاؤں کس کی آنکھوں سے کہو اس چشمِ حیراں کو | عیاں جب ہر جگہ دیکھوں اُسی کے رازِ پنہاں کو
تجھے اے شمع کیا دیکھوں زمانہ تو دکھاتا ہے (۱) | ہمیں جو کاغذِ آتش زدہ اور ہی چراغاں کو
نہ تنہا کچھ یہی اطفال دشمن ہیں دوانوں کے | بھری ہے کوہ بھی دیکھا تو یاں پتھروں سے داماں کو
چمکتے ہیں ستاروں کی طرح سوراخ سینے کے (۲) | چھپایا گو کہ جوں خورشید میں داغ نمایاں کو
نہ واجب ہی کہا جاوے نہ صادق ممتنع آئے (۳) | کیا تشخیص کچھ ہم نے نہ ہر گز شخصِ امکاں کو

---

(۱) کاغذ کو جب آگ دی جاتی ہے۔ تو وہ پیچ و تاب کھا کر جگہ جگہ سے آگ پکڑ لیتا ہے اور چراغاں کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے شمع میں تیری روشنی کو کیا دیکھوں، تیرا کام تو جلانا ہے۔ شمع سے مراد دنیا۔ اور کاغذِ آتش زدہ سے اہلِ دنیا۔ شاعر کہتا ہے کہ دُنیا میں تیری چمک

دنک نہیں دیکھتا۔ بلکہ اہل دنیا کی تباہ حالی کو دیکھتا ہوں کہ تو نے اُن کے ساتھ کیا کیا۔ نیز یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں عشرتِ دُنیا سے کیا لطف اندوز ہوں زمانہ تو دل پر داغ دے رہا ہے۔

(۲) عشق خدا چھپائے سے نہیں چھپتا۔

(۳) شخص امکاں۔ یعنی انسان نہ اس کو واجب الوجود کہا جا سکتا ہے نہ اس کی حقیقت سے انکار ہی کیا جا سکتا ہے۔ غرضکہ انسان ایک چیستاں ہے۔

نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضئ الٰہی ہو
نگینے کے سوا کوئی بھی ایسے کام کرتا ہو
(۱) کہ ہو نام اور کا روشن اور اپنی روسیاہی ہو
نہیں شکوہ مجھے کچھ بیوفائی کا تری ہرگز
گلا تب ہو اگر تو نے کسو سے بھی نباہی ہو

---

(۱) شاعر کہتا ہے کہ اپنے کو بدنام کرا کر دوسرے کی نیک نامی کرانے والا ہم نے سوائے مہر کے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ تعلیل یہ ہے کہ مہر کو لگانے سے پہلے سیاہ کیا جاتا ہے۔ اس پر روشنائی لگائی جاتی ہے۔ جس کو شاعر روسیاہی سے تعبیر کرتا ہے۔ کہتا ہے خود بدنامی اٹھاتی ہے اور دوسروں کا نام ابھارتی ہے۔

رباعیات

اے درد یاں کسو سے نہ دل کو پھنسائیو
لگ چلیو سب سے یوں تو پہ جی مت لگائیو
میں دل کے ساتھ کب تئیں کشتی لڑا کروں
اب اختیار ہاتھ سے جاتا ہے آئیو

اپنے بندے پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
یہ نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

مت کہیں عیش تمھارا بھی منغض ہووے
دوستاں درد کو مجلس میں نہ تم یاد کرو

ہم معنی شعر ملاحظہ ہوں۔

درمحفل خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

شریکِ بزمِ عشرت ہوں مگر خاطر مکدر رہ
دہانِ خم ہوں ہنسنا مرا رونے سے بدتر ہے

کہنا ٹک اشتیاق تو رفتار یار کو
آنکھوں ہی رکھوں کب تلک میں انتظار کو

ویسا ہی اب تلک ہے وہ دامن تو اے صبا
کیدھر لئے پھرے ہے تو میرے غبار کو

سررشتۂ نگاہِ تغافل نہ توڑیو
اے ناز اس طرف سے منہ اس کا نہ موڑیو

جاوے در قفس سے یہ بے بال و پر کہاں
صیاد ذبح کیجیو پر اس کو نہ چھوڑیو

کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تغافل سے بھی محروم ہو جائیں۔ درِ صیاد سے جانا نہیں چاہتے وہیں مرجانا چاہتے ہیں۔

دے لے جو کچھ کہ شیشے میں باقی شراب ہو
ساقی ہے تنگ عرصۂ فرصت شتاب ہو

کہتا ہے آئینہ کہ نہیں ہے بعید اگر
دوراں کے ہاتھ سے دل آہن بھی آب ہو

ساقی جو شراب باقی بچی ہے جلد دے۔ فرصتِ ہستی و رخصتِ حیات بہت کم ہے۔ آئینہ کہہ رہا تھا کہ زمانے کے ہاتھوں لوہے کا جگر آب

آب ہو جائے تو کچھ بعید نہیں۔ دلو ہے کو صیقل کر کے آئینہ بناتے ہیں اور آئینے میں آب ضروری۔

کبھو ہم نے نہ پایا مہرباں اے تند خو تجھکو
نہ دیکھا آنکھ بھر کے ایک دم خورشید رو تجھ کو

تمنائیں مبدّل حسرتوں سے ہوگئیں دل میں
رہی تو بھی نہ ملنے کی ہماری آرزو تجھ کو

دل نالاں کو یاد کر کے صبا
اتنا کہنا جہاں وہ قاتل ہو

نیم بسمل کوئی کسو کو چھوڑ
اس طرح بیٹھتا ہے غافل ہو

فرد

میں نہیں کہتا کہیں تم اور مت جایا کرو
بندہ پرور اس طرف کو بھی کبھی آیا کرو

ردیف الہا

(۱) ہر طرح زمانے کے ہاتھوں ہوں ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشن دوراں میں اے خفگیٔ طالع
سر سبز تو ہیں لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

اے شورِ قیامت رہ اودھر ہی میں کہتا ہوں
چونکے نہ ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ایدھر کو نگہ کوئی چھپکی بھی تو دزدیدہ

مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا بارے
زلفوں میں کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

بدخواہ سبھی عالم گو ہووے تو ہو لیکن
یارب نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ
اے درد یہ تیرا تو ہر مصرعِ چسپیدہ

(۱) خوابیدہ کی صفت بخت اور سبزے کے ساتھ مشترک ہے، شاعر کہتا ہے زمانے نے امرت دیا تو اس میں زہر کی آمیزش تھی. خوشی کے پس منظر میں رنج پنہاں. نوش کے ساتھ نیش شریک. ہم کو سرسبز بھی کیا تو سبزۂ خوابیدہ کی مانند خاک فتادہ رکھا۔

رکھتی ہے میرے غنچۂ دل میں وطن گرہ
(۱) تجھ سے نہ کھل سکے گی صبا یہ کٹھن گرہ

چشمِ کشادِ کار کسو سے نہیں مجھے
(۲) رکھتا ہوں میں بسانِ گہر جملہ تن گرہ

پہنچی اگر اس طرف کبھی تری زلف کی شمیم
نافہ ہی میں ہو نکہتِ مشکِ ختن گرہ

اپنی اگر گرفتہ دلی ذکر کیجئے
(۳) ہو سبحہ وار خاطرِ یک انجمن گرہ

ہر چند سعی میں ہے سدا ناخنِ ہلال
کھلتی ہے پر سپہر کی کوئی کہن گرہ

جب چاہیئے کہ عقدۂ دل تجھ پہ کھولئے
ہوتا ہے آ زباں پہ میرے سخن گرہ

تنگی سے تن کے جامہ کی ہوتا ہے دم خفا
(۴) ہے جوں حباب جاں پہ یہ پیرہن گرہ

ہر چند کھولی تو نے تو پتھر کے جی سی گانٹھ
شیریں کے دل سے پر نہ کھلی کوہکن گرہ

کیونکر یہ کارِ عشق گرہ در گرہ نہ ہو
یاں دل گرہ کی شکل ہے اور واں دہن گرہ

جیتا کسی کو چھوڑے نہ یہ گانٹھ زہر کی
زلفِ سیہ وہ سانپ ہے جس کا ہے من گرہ

واشد کبھو تو درد کے بھی ساتھ چاہیئے
بندِ قبا سے کھول ٹک اے گلبدن گرہ

---

(۱) صبا کا کام تو غنچہ کو وا کرنا ہے جو گرہ سے مشابہ ہے. شاعر کہتا ہے کہ اس صفت کے باوجود میرا عقدۂ دل تجھ سے وا نہ ہو سکا۔

(۲) میرا عقدۂ مشکل کوئی وا نہیں کر سکتا ہیں تو گوہر کی مانند ہمہ تن گرہ

ہوں۔ وا ہو کیونکر، میری کل ہستی ایک عقدۂ مشکل ہے۔ گوہر گول ہوتا ہے اور گرہ سے مشابہ۔

(۳) تسبیح میں سو دانے ہوتے ہیں اور ہر ایک گرہ سے مشابہ۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ پوری انجمن کے دل میں گرہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر میں اپنی گرفتہ دلی یا افسردہ دلی بیان کروں تو تسبیح کی مانند ساری محفل گرہ در دل ہو جائے۔ نیز دل میں گرہ ہونے کے معنی اردو میں کینہ اور کپٹ ہونے کے آتے ہیں۔ لیکن شاعر یہاں وہ معنی نہیں لے رہا ہے۔ چونکہ دل میں گرہ ہونا، الفاظ استعمال نہیں کئے گئے بلکہ "خاطر یک انجمن" کہا گیا ہے۔ جس کے معنے افسردہ دلی کے ہیں۔

(۴) شاعر حباب کو اوپر کی سطح سے الگ چیز تصور کرتا ہے اور پانی جو شکل اختیار کر لیتا ہے اس کو پیرہن سے تشبیہہ دیتا ہے۔ یعنی اصل حباب ہوا ہے جو بلبلہ کے اندر ہے اور اوپر جو پانی ہے وہ پیرہن کے مرادف۔ جیسے کہ روح کے لئے جسم پیراہن ہے۔ حباب کے اندر کی ہوا اس پیرہن سے نکلنے کے لئے بیچین رہتی ہے اور آخر کار جامہ دریدہ کر دیتی ہے۔ بعینہ قلب انسانی اس پیرہن خاکی سے نکل آنے کو بے قرار رہتا ہے۔

---

(۱)

رابطہ ہے نازِ بتاں کو تو مری جان کے ساتھ
جی ہے وابستہ مرا ان کی ہر ایک آن کے ساتھ

اپنے ہاتھوں کے بھی ہیں زور کا دیوانہ ہوں
رات دن کشتی ہی رہتی ہے گریبان کے ساتھ

جو جفا جو ہیں انھیں سنگدلی لازم ہے
کام تلوار کو رہتا ہے سدا سان کے ساتھ

گر مسیحا نفسی ہے یہی مطرب تو خیر
جی ہی جاتے ہیں چلے تیری ہر اک تان کے ساتھ

درد ہر چند ہیں ظاہر میں گو ہوں مورِ ضعیف
زور نسبت ہے وَلے مجھکو سلیمان کے ساتھ

(۱) اس شعر میں دیوانہ ہوں" کے معنی ہیں۔ فریفتہ ہوں۔ والہ و شیدا ہوں۔ نیز دیوانگی کی شان بھی یہی ہے کہ دست و گریبان دست و گریباں ہیں۔

---

(۱) تم نے کیا قہر کیا بال و پرِ پروانہ	کاش تا شمع نہ ہوتا گذر پروانہ
(۲) پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ	شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اسے
(۳) نت رہے آگ میں سوزِ جگر پروانہ	گر ترا حسن برشتہ نظر آجائے اُسے
سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظر پروانہ	کیوں اُسے آتشِ سوزاں میں لئے جاتی ہے
(۴) رہرو و رشک کی جا ہے سفر پروانہ	ایک ہی جست میں لی منزل مقصود اُس نے

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی
پوچھوں اے درد میں کس سے سفر پروانہ

---

(۱) اگر پروانے کے بال و پر نہ ہوتے تو شمع تک اُس کی رسائی نہ ہوتی اور سوختہ نہ ہوتا۔ بال و پر پروانہ طاقتِ پرواز اس کے لئے موجبِ ہلاکت ہوئی۔ شاعر کی مراد اس تمثیل سے انسان پر روشنی ڈالتی ہے۔ اگر اس کو اختیار نہ ہوتا۔ امتیاز نیک و بد نہ ہوتا۔ شعور نہ ہوتا تو مکلف نہ کیا جاتا۔ عقل انسانی کی بلند پروازی اور تلاشِ ارتفاع نے اس کو گرفتار آفات و مصائب کیا۔ اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی۔

(۲) اثر بمعنے نشان۔ میر تقی میر فرماتے ہیں۔

شمع تک ہم نے بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیا
پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب

(۳) حسن برشتہ، بمعنی حسن ملیح مائل بہ سرخی۔ جس کو ہم چمپئی رنگ یا کندن

کا رنگ کہتے ہیں۔ نیز برشتہ کے معنی مرغوب و محبوب کے بھی ہیں۔ شاعر کہتا ہے، کہ اگر تیرا حسن برشتہ پروانے کو نظر آجائے تو اس کا سوزِ جگر آتشِ سوزاں میں (در آتش) مبتلا رہے نیز اگر آگ کو تیرا حسن برشتہ نظر آجائے تو اس میں سوزِ جگر پروانہ پیدا ہو جائے دوسرے معنی بہتر معلوم ہوتے ہیں، بہرکیف "اُسے" کی ضمیر دونوں طرف راجع ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعر پروانے سے خطاب کر رہا ہے۔ اور "تیرا" کی ضمیر پروانے کی جانب راجع ہے۔

(۴) اے سالکان رہِ عشق رفتارِ پروانہ قابلِ رشک ہے۔ بس ایک جست میں بیڑا پار تھا۔ لَو سے لَو لگائی شمع سے ہم آغوش تھا۔

---

(۱)
دل پہ بے اختیار ہو گر آہ — تو ہی کہہ کب تلک نہ اُٹھے کراہ
خوش خرامی بھی اِدھر کیجئے گا — میں بھی جوں نقش پا ہوں چشم براہ
کیا کہوں تجھ سے ہمنشیں دل میں — برچھی سی لگتی ہے وہ ترچھی نگاہ

(۲)
جو ہوئے ہیں قرار آپس میں — میں ترا اور تو مرا ہے گواہ
جس پہ تقصیر وار تو سمجھو — ابھی ایسا تو کچھ نہیں ہے گناہ
ہنسنے اور بولنے کی باتیں کرو — نام اس کا نہ لو کہاں ہے چاہ
دید وا دید رکھے جایئے گا — جب تلک ہو ملاپ خاطر خواہ
بت پرستی نہیں شعار اپنا — ہم کو ایسا نہ سمجھیو واللہ
شوخ تو اور بھی ہیں دنیا میں — پر تری شوخی کچھ عجب ہے واہ
ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے — کوئی اس بات سے نہ ہو آگاہ
دیدِ وا اپنی طرف سے حاضر ہے — آگے پھر ہے تمھارے ہاتھ نباہ

(۱) دل پر جب حد اختیار سے زیادہ آہ طاری ہو تو پھر کیوں کر نہ کراہ اُٹھے اور کب تک ضبط کرے۔

(۲) "الست بربکم" و "قالو بلا" کی طرف اشارہ ہے۔

جوں جرس دل کے ساتھ میرے آہ　　نہیں نالے سوا کوئی ہمراہ

قصّہ زلف یار کیا کہئے　　ہے دراز اور عمر ہے کوتاہ

(۱) درویش ہوں مری تعظیم

خلق کرتی ہے کہہ کے یا اللہ

---

(۱) درویشوں کے ایک گروہ کا دستور ہے کہ بجائے سلام مسنون کے آتے جاتے "یا اللہ" کہتے ہیں۔

دل سوا کس کو ہوا اس زلف گرہ گیر میں راہ　　ہے دوانوں کی طرح خانۂ زنجیر میں راہ

ہم سے بے جانوں سے شرمندہ دم عیسیٰ ہے　　(۱) ہو صبا کے تئیں کب غنچۂ تصویر میں راہ

نالہ دل میں لئے تجھ کو پھرا شہر بہ شہر　　آہ پر تو نے نہ کی ٹک دل تاثیر میں راہ

---

(۱) ہم وہ کشتہ ہیں کہ دم عیسیٰ بھی ہم کو زندہ کرنے سے قاصر ہے۔ مثال کے طور پر دیکھ لو صبا کا کام غنچے کو شگفتہ کرنا ہے۔ لیکن غنچۂ تصویر میں نمو اور شگفتگی پیدا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہے۔ وہاں صبا کی بھی ہوا خیزی ہو جاتی ہے۔

رباعی

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ
بندہ گر آوے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ
آہن ہو یا ہو سنگ ہے سب جلوہ گاہِ یار
جوں آئینہ ہر ایک گذر میں صفا کو دیکھ

---

(۱) اس شعر میں مسئلہ "ہمہ اوست" مثال دے کر واضح کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ چشم بینا لوہے اور پتھر میں بھی آئینے کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اور حقیقت ہے کہ پتھر سے شیشہ بنتا ہے۔ اور لوہے کو صیقل کرکے اُس سے بھی آئینے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ چشم دیدہ ور تگدر میں بھی صفا کا مشاہدہ کرتی ہے۔

ردیف الیا

اُس کی بہار حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے
فصلِ بہار جس کی ہاں ایک یہ گلفروش ہے
بخت سیہ برنگِ شب نت ہی گلیم پوش ہے
(۱) شمع بھی اپنے ہاں اگر ہے تو سدا خموش ہے
خلوت دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل
(۲) حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہے
ہوئیے تو درمیاں سے آپ اپنے تئیں اُٹھائیے
(۳) بار نہیں ہے اور کچھ سر ہی وبالِ دوش ہے
نالہ و آہ کیجئے خون جگر ہی پیجئے
(۴) عہدِ شباب کہتے ہیں موسم نائو نوش ہے
خیر تجھے جو چاہئے بدرقۂ جنوں نہ چھوڑ
(۵) ہمنے جہاں کی سیر کی رہزنِ خلق ہوش ہے
بے خبروں کو پھر کہیں دستِ قضا نہ چھیڑ لو
مثل دلِ ہر ایک میں ورنہ بھرا خروش ہے
غیر ملال زاہدا کیا ہے طریق زہد میں
دل ہو شگفتہ جس جگہ کوچۂ مے فروش ہے
اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ و جامے سے نہیں
(۶) درد اگر لباس ہے دیدۂ عیب پوش ہے

(۱) شاعر انتہائے تیرہ بختی کا اظہار کرتا ہے۔

(۲) دل کی خلوت گزینی کے سبب ہمارے حواس میں خلل آگیا ہے۔ ہماری طبیعت بدل گئی ہے۔ جو چیزیں خوش آئندہ تھیں وہ ناگوار ہونے لگیں۔ مثلاً حسن فردوس نگاہ تھا۔ اب بار نظر ہے۔ سماع سامعہ نواز تھا۔ اب کانوں پر گراں گذرتا ہے۔

(۳) انسان کی اپنی ہستی اُس کے اور خدا کے درمیان حائل ہے۔

(۴) شاعر کہتا ہے کہ شباب کو دنیا کھانے پینے اور شور و شغب کا زمانہ کہتی ہے اگر ہے تو خون جگر پیجئے اور آہ و نالہ کیجئے۔

(۵) "بدرقہ" راہبر کو کہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ بیخودی خضر راہ ہے اُس کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے۔ عقل و ہوش غول بیابانی ہے۔

(۶) ملبوسات ظاہری پردہ دار نہیں۔ حقیقی پردہ دار تو نگاہ عیب پوش ہے۔

آفت جانِ دل تو یاں وہ بت خود فروش ہے
پہلے ہی جس کے پیشکش صبر و قرار و ہوش ہے

دل کو سیاہ مست کر کچھ بھی تجھے جو ہوش ہے
کہتے ہیں کعبہ اس کو اور کعبہ سیاہ پوش ہے

کس کی یہ ہوتی ہے صبا گفت و شنید باغ میں
غنچہ سبھی وہاں ہیں گل بھی تمام گوش ہے

(۱) آتش گل جنوں مرا گرم کرے سو یہ نہیں
سینہ ہمیشہ آگ ہی دل میں سدا ہی جوش ہے

حادثۂ زمانہ کیا تیری جفا سے کیا بلا
ہم کو سپہر مست ڈر انیش بھی یاں تو نوش ہے

ہم سے تو ایک معصیت چاہیں چھپے نہ چھپ سکے
اپنے گناہ کو ترا عفو ہی پردہ پوش ہے

آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا بیاں
منہ پہ ہے مہر خامشی دل میں بھرا خروش ہے

(۲) دور نہیں ہوا ہمیں رنج شعور ساقیا
یک دو سہ جام اور بھی باقی ابھی تو ہوش ہے

محنت و رنج و غم سے یاں درد نہ جی چھپائیے
بار سبھی اُٹھائیے جب تئیں سر پہ دوش ہے

(۱) ہمارا جنوں محتاجِ بہار نہیں۔
(۲) ابھی احساسِ خودی باقی ہے۔ تھوڑی شراب اور دے۔

اُس کو سکھلائی یہ جفا تو نے | کیا کیا اے مری وفا تو نے
بیکسی کو عبث کیا بیکس (۱) | قتل کر مجھ کو کیا کیا تو نے
حال سن سن مرا لگا کہنے | میں سنا کچھ نہ کیا کہا تو نے
ہم نہ کہتے تھے ہو جو مت عاشق | پائی دل اپنی کچھ سزا تو نے
جی تو جی سے ترے رہا ہے مل | (۲) منہ لیا موڑ کیا ہوا تو نے

دردؔ کوئی بلا ہے شوخ مزاج
اس کو چھیڑا بُرا کیا تو نے

---

(۱) بیکسی کا یار و مددگار لے دے کر ایک میں ہی تھا۔ آج میرے نہ ہونے سے بیکسی خود بیکس ہو گئی۔
(۲) "کیا ہوا" یعنی کیا مضائقہ ہے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اگر تم ظاہرا نہیں ملتے تو کیا ہے۔

دل مرا پھر دکھا دیا کس نے | سو گیا تھا جگا دیا کس نے
میں کہاں اور خیالِ بوسہ کہاں | منہ سے منہ یوں بھڑا دیا کس نے
وہ مرے چاہنے کو کیا جانے | یہ سند لیسا سنا دیا کس نے
ہم بھی کچھ دیکھتے سمجھتے تھے | سب یکایک چھپا دیا کس نے
وہ بلانے سے بھاگتا تھا اور (۱) | دردؔ تجھ تک بلا دیا کس نے

(۱) "بلانے" سے مراد سمجھنے کی کوشش ہے۔ ادراکِ ذاتِ خداوندی۔ شاعر کہتا ہے جتنی بھی انسان اس ذات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے دور ہوتا جاتا ہے۔ تجھ کو یہ عرفان کس ذریعے سے حاصل ہوا۔

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے (۱) لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی (۲) خطرہ جو ہے سو آئینہ دل پہ زنگ ہے

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ (۳) یاں ٹک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں (۴) اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

گلگیر منہ پسار نہ تو شمع کی طرف (۵) اس کی زبان ہی آسے کام نہنگ ہے

کب ہے دماغ عشقِ بتانِ فرنگ کا مجھ کو تو اپنی ہستی ہی قیدِ فرنگ ہے

عالم سے اختیار کی ہر چند صلح کل پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

میں کیا کہوں تجھے نظر آتا نہیں ہے کیا اس گلشنِ جہان کا جو کچھ کہ ڈھنگ ہے

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہوئے کہ اس ہس دید (۶)
دیکھا چمن میں جا کے تو کچھ اور ہی رنگ ہے

---

(۱) سنگ بمعنی گراں۔ نیز لوحِ مزار ہوتی بھی سنگ کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ لذتِ فنا سے آشنا اور اس پر فنا ہیں ان کو ہستی کا نام تک گوارا نہیں۔ اور لوح اس امر کی دلیل ہے کہ یہ شخص کبھی عالمِ ہستی سے تعلق رکھتا تھا۔

(۲) فکرِ ماسوا قلبِ انسانی کو جلا نہیں پانے دیتی تو اس سے بالاتر ہو جا۔

(۳) شاعر دعویٰ کرتا ہے کہ تماشہ گاہِ عالم کو جس نے بھی آنکھ کھول کر

دیکھا وہ ہی حیران و ششدر رہ گیا۔ دلیل میں آئینے کو پیش کرتا ہے۔ جو چشم وا بھی ہوتا ہے اور حیران بھی۔ اوّل الذکر تو اس بنا پر کہ اس میں ہر چیز نظر آتی ہے آخر الذکر کی یہ دلیل کہ اس کی آنکھ بند نہیں ہوتی۔ ہمہ وقت کھلی رہتی ہے۔ نیز آنکھ کا زیادہ کھلنا یا زیادہ دیر تک کھلے رہنا حیرانی کی دلیل ہے۔

(۴) جذبۂ ظہورِ صفاتِ الٰہی وجہ آفرینش دنیا ہے، ورنہ انسان کہاں اور یہ دنیا کہاں۔ اس معبود نے جب رشتۂ عبد و معبود کو منظر عام پر لانا چاہا تو یہ دنیا پیدا کی۔

(۵) اے گلگیر تو منہ پھاڑ کر شمع کی جانب نہ جا اس کی اپنی ہستی اُسے فنا کر رہی ہے اس کی لو جو نشانِ حیات ہے وجہِ مرگ بھی ہے۔ بعینہٖ انسان کا سانس جو باعثِ حیات ہے موت کو قریب تر لا رہا ہے۔

(۶) شاعر بے ثباتیٔ عالم کو دکھا رہا ہے۔ غنچے کے شگفتہ ہوتے ہوتے رنگِ چمن بدل چکا تھا۔ آمد آمد کی صدائیں بلند تھیں۔ شادیانے کی آواز فضا میں ابھی گونج رہی تھی کہ کوسِ رحلت بج گیا۔ آنکھ کھلنے نہ پائی تھی کہ بند ہوگئی۔

وحدت نے ترے ہر طرف جلوے دکھا دیئے
پردے تعیّنات کے جو تھے اٹھا دیئے

(۱) ہوں کشتۂ تغافل ہستیٔ بے ثبات
خاطر سے کون کون نہ اپنے بھلا دیئے

(۲) روتی ہیں چشم اب تئیں یہ تیرے داد خواہ
کتنے ہی تیغ ابرو نے قصے چکا دیئے

عنقا کی طرح جتنے تھے یاں نامور فلک
تو نے خدا ہی جانے کہ کیدھر اڑا دیئے

پگھلا دلِ اثر نہ میرے حال پر کبھی
ہر چند روتے روتے میں نالے بہا دیئے

یارب یہ کیا خرام ہے جنے اک آن میں
کتنے ہی مردے حشر سے آگے جلا دیئے

عالم میں جتنے پاک گہر تھے سو ایک ایک
افسوس سے روزگار نے یوں ہی گھلا دیئے

صیاد کہتے ہیں کہ گرفتاریاں گئی (۳) صدقے کراپنے آج کسی نے چھڑا دیئے
ابر مژہ یہ چشم تو کیا ہے کہ گھر کے گھر تو نے برس برس کے ہزاروں بہا دیئے
دونوں جہاں کی نہ رہی پھر خبر اسے دو پیالے تیری آنکھوں نے جس کو پلا دیئے
اے شورِ حشر گردشِ دوراں نے اہلِ قبر (۴) ٹک بھی نہ سونے پائے کہ دو ہیں جگا دیئے
چاہو وفا کرو نہ کرو اختیار ہے خطرے جو اپنے جی میں تھے وہ سب اٹھا دیئے

سیلابِ اشکِ گرم نے اعضا مرے تمام
اے دردؔ کچھ بہائے اور کچھ دبا دیئے

---

(۱) اس دنیا کے چکر نے ہمارے دل سے کس کس کو نہ محو کر دیا۔ حتیٰ کہ خدا تک کو بھول گئے۔

(۲) قصے چکا دیئے۔ قصے ختم کر دئے۔ یعنی مار دیئے۔

(۳) اکثر اہل ہنود چڑی ماروں سے پرندے چھڑا دیتے ہیں۔ گرفتار دام۔ صیاد سے دریافت کرتا ہے کہ کیا یہ خبر سچ ہے کہ اس جگہ اہلِ خیر نے بہت سے پرند آزاد کرا دئے ہیں۔ اس سوال میں دل کی یہ پکار مضمر ہے کہ کاش کسی کی نظر کرم ہم پر بھی پڑ جائے۔

(۴) حشر میں مردہ اٹھا کھڑے کئے جائیں۔ گردشِ دوراں نے بھی یہی کیا۔ مدعا یہ کہ گردش روزگار قیامت خیز ہے۔

گر باغ میں خنداں وہ مرا لب شکر آوے گل سامنے داماں سے منہ ڈھانپ کر آوے
قاصد سے کہو پھر خبر ادھر ہی کو نے جائیے (۱) یاں بیخبری آگئی جب تک خبر آوے
لوٹے ہے تری گنج شہیداں کو غریبی (۲) جی دینے کو ظالم کوئی کس بات پر آوے

زاہد کو جتا دیجیو بیخود ہیں یہ رنداں (۱) آتا ہے تو خودداری کو گھر میں ہی دھر آوے
کہتے ہیں کہ یک دست تیری تیغ چلی ہے (۲) تب جانیے کہ جب اک دو قدم چل ادھر آوے
جوں خواب ہے وابستہ بغفلت یہ تماشا (۳) کھل جائے اگر آنکھ تو پھر کیا نظر آوے
اے طبع رواں تیری مدد ہووے تو شاید اس بحر میں ہم سے بھی کوئی شعر تر آوے

مطلق بھی نہیں دردِ اضافت سے مبرا
عہدے سے تقید کی کوئی کیونکہ بر آوے

---

(۱) ہم عالم ہوش و بیہوشی میں عرصۂ حیات طے کر رہے تھے۔ جب ہوش تھا پیام و سلام کی تلاش تھی۔ عالم بے ہوشی و خود فراموشی میں اس سے مستغنی ہو گئے۔ قاصد سے کہدو کہ جہاں سے پیام لایا ہے وہیں واپس لے جائے۔ اس لئے کہ اب ہم خود اس مقام پر ہیں جہاں سے وہ پیغام لایا ہے دوری تو ہوش کی وجہ سے تھی۔ بے ہوشی نے قرب عطا کیا۔

(۲) شہدا کو ایک جگہ اکٹھا سپردِ خاک کر دیتے ہیں۔ اس کو گنجِ شہیدا کہتے ہیں۔

(۳) شاعر کہتا ہے کہ عالم ہستی کا وجود ہماری کوتاہ نظری کی وجہ سے ہے۔ اگر چشم دوربیں حاصل ہو تو یہ تماشہ گاہِ عالم بے حقیقت ہے۔ دنیا کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں جس کا انحصار غفلت پر ہے۔ اگر انسان سو نہ رہا ہو تو خواب نہیں دیکھ سکتا۔ آنکھ کھل جانا زبان میں دو معنی رکھتا ہے۔ سوتے سے جاگ جانا، نیز حقیقت آشنا ہونا۔

(۴) مطلق سے مراد ہستی مطلق یعنی خدا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہستیٔ مطلق کے ساتھ صفات کی اضافتیں لگی ہوئی ہیں مثلاً۔ خدائے واحد،

خدائے بزرگ. بپس اس عالم تعینات میں جب وہ ہستی تقید سے باہر نہیں تو اور کسی کو قید و بند سے کس طرح مفر ممکن ہے۔

اذیت کوئی تیرے غم کی میرے جی سے جاتی ہے (۱)
کبھو ٹک دل کیا خالی تو پھر چھاتی بھر آتی ہے
سناؤں کیونکہ اپنا حال میں کیا سخت مشکل ہے
یہ قصہ جب لگوں کہنے تو اُس کو نیند آتی ہے
نہیں مشتاق آئینہ کے وہ جو صاف طینت ہیں (۲)
صفا تو عارضی ہے اور کدورت اُس کی ذاتی ہے
قیامت سرزمین دل پہ میرے حشر برپا ہے (۳)
ہوس ہر دم تمنائیں تو یہ یہ کچھ اُٹھاتی ہے
اگر آئینہ چار آئینہ ٹھہرے تو نہ ہو سکتا (۴)
سپر ہوں تیر مژگاں کا سو یہ میری ہی چھاتی ہے
پر یکھانت یہی رہتا ہے مجھ کو درد کیا کہئے
کہ ایسی زندگی سی چیز یوں ہی مفت جاتی ہے

(۱) دل خالی کرنا" دل کی بھڑاس نکالنا۔ آہ و نالہ کرنا۔ رنج والم کا ذکر کرنا۔ چھاتی بھر آنا۔ آنسوؤں کا اُمڈ کر آنا۔

(۲) آئینہ شیشے سے بنتا ہے جو پتھر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور لوہے سے بنایا جاتا ہے۔ ان دونوں میں صفا کیسی ہے۔ اور تکدر طبیعی۔ شاعر کا مدعا ہے کہ اہل باطن ادراک خداوندی کے لئے دُنیا میں نہیں

پھنستے ۔اہلِ دل کو عشق حقیقی حاصل کرنے کے لئے عشق مجازی کی منازل طے کرنی ضروری نہیں ۔

(۳) " قیامت " یعنی بہت ۔

(۴) چار آئینہ مدافعت کا ہتھیار ہے ۔سینہ، کمر اور پہلوؤں پر باندھا جاتا ہے ۔سنکھ معنی مقابل ۔شاعر کہتا ہے کہ آئینہ جو ہمہ وقت تیرے روبرو رہنے کا عادی ہے ۔اگر اُس کا چار آئینہ بنایا جائے تو تیر مژگاں سے منہ پھیر جائے ۔یہ میرا ہی دل و جگر ہے کہ تیرے مدمقابل ہے ۔

چھاتی پہ گر پہاڑ بھی ہووے تو ٹل سکے
مشکل ہے جی میں بیٹھے سو جیسے نکل سکے

نشو و نما کی کس کو اُمید اے بہار یاں
میں خشک شاخ ہوں کہ نہ پھولے نہ پھل سکے

تحریک ہے یہ اس ید قدرت کی ورنہ کب
بے دستِ پا صبا سے کوئی پات ہل سکے (۱)

مثلِ حباب جب کہ نظر سے گیا گیا
میں وہ غریق ہوں کہ نہ ڈوبا اچھل سکے (۲)

گرنے نہ دیویں خلق کی نظروں سے دل کو ہم
کوئی اگر کسو کے سنبھالے سنبھل سکے

روشن ضمیر جتنے ہیں عالم میں جوں نجوم
چرخ آسیا سے اپنے یہ دانے نہ دل سکے

دینے عبث ہو شیشہ گراں سنگ کو گداز
پگھلائے جو تم سے کوئی دل پگھل سکے

کہہ اور بھی غزل کوئی پر اس ردیف میں
اے درد قافیہ کو اگر تو بدل سکے

---

(۱) صبا تو خود بے دست و پا ہے ۔اگر منشائے ایزدی شامل حال نہ ہو تو ایک پتے کو بھی جنبش میں نہیں لاسکتی مجبور انسان بغیر تائید و توفیق خداوندی کے کچھ نہیں کر سکتا ۔

(۲) فطرتاً ہر ڈوبنے والے انسان کو پانی تین مرتبہ اچھالا دیتا ہے۔ لیکن حباب غرق آب ہوتا ہے۔ پر ایک مرتبہ بھی اچھالا نہیں لیتا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بھی حباب دار غرق ہوا کہ پھر اُبھر نہ سکا۔

(۳) گردش فلک کے باوجود دانہائے انجم قائم و دائم ہیں۔ اس ہی طرح گردش روزگار اہل دل روشن ضمیر اہل اللہ کو نہیں مٹا سکتی۔

(۴) ہم معنی شعر خواجہ میر درد ہی کا ملاحظہ ہو۔

اکسیر پر مہوس اتنا نہ ناز کرنا
بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے — آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے
میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے — نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے — اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے
غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار — اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے
یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک فہم یاں — دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے
گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول — دل سے اٹھا خلاف اگر تو اٹھا سکے
اطفائے نارِ عشق نہ ہو آب اشک سے — یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

---

(۱) قلب انسانی انوارِ خداوندی کا حامل ہے۔

(۲) غافل کا اشارہ عابد و زاہد کی طرف ہے۔ خدا کی یاد بمعنی عبادت۔ "بھولنا" یعنی غرہ کرنا۔ گھمنڈ کرنا۔ شاعر صوفی منش عابد و زاہد کو مخاطب کر کے کہتا

ہے اپنی عبادت پر گھمنڈ نہ کر یہ خدا تک نہیں پہنچا سکتی۔ اپنی ہستی کو بھول جا تب اس کو پائے گا۔

(۳) عقل کی قوتِ ادراک ایک گورکھ دھندا ہے۔ جس سے وہ خود باہر نہیں نکل سکتی۔

قسم ہے حضرت دل ہی کے آستانے کی
ہوس ہو جی میں جو دیر و حرم کے جانے کی

طریق اپنے پہ اک دورِ جام چلتا ہے
وگرنہ جو ہے سو گردش میں ہے زمانے کی

کیا جگر کو مرے داغ تیرے وعدوں نے
خبر سنی جو کہیں میں کسو کے آنے کی

نظر نہ کیجیو تو میرے دل کے خطروں پر
نہ جی میں لائیو کچھ بات کیا دوانے کی

جفا و جور اٹھانے پڑے زمانے کے
ہوس تھی جی میں کسو ناز کے اٹھانے کی

طریقِ ذکر تو ہے درد یادِ عالم کو (۱)
طرح نہ پائی کچھ اپنے تئیں بھلانے کی

---

(۱) "ذکر" سے مراد ذکرِ خداوندی یعنی عبادت۔

کوئی بھی دوا اپنے تئیں راس نہیں ہے
جز وصل سو ملنے کی ہمیں آس نہیں ہے

وہ اشک نکلتا ہے مری چشم سے جس کا
ہر قطرہ کم از پارۂ الماس نہیں ہے

زنہار ادھر کھولیو مت چشمِ حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

گذرا ہے بتا کون صبا آج ادھر سے (۱)
گلشن میں ترے پھولوں کی یہ باس نہیں ہے

بے فائدہ انفاس کو ضائع نہ کرے درد
ہر دم دمِ عیسیٰ ہی تجھے پاس نہیں ہے

(۱) گل ہائے گلشن میں آج ہم نیا رنگ و بوپا رہے ہیں۔ چمن پر کچھ اور ہی دلفریبی ہے۔ نیز رہے پھولوں کی تو یہ بُو باس نہیں، بتا کون ادھر سے گذرا ہے کہ رنگِ چمن بدلا ہوا ہے۔ مدعا یہ کہ اہل بینش اس خاکدان میں کسی اور ہی کا جلوہ پاتے ہیں۔

(۲) زندگی کے ایک سانس کو بھی بیکار نہ رکھو۔ ان میں ہر ایک دم عیسیٰ کے مترادف ہے۔ نفس عیسوی زندگی بخش تھا۔ سانس بھی وجہ حیات ہے۔ نیز اگر زندگی کا صحیح استعمال کیا جائے تو انسان مرنے کے بعد بھی زمانے میں زندہ رہتا ہے۔ پس ہمارا ہر سانس دمِ عیسیٰ کے مدمقابل ہے۔

---

(۱) ہر بزم طرب چوں مژہ برہم زدنی ہے
یاں عیش کے پردے میں چھپی دل شکنی ہے

دل ٹکڑے کیا ہے یہ مرا کس کے لبوں نے
جو لخت ہے سو رشکِ عقیق یمنی ہے

کیا کام مجھے خوف و رجا کا کہ مرے پاس
ہے جان سو بے جان ہے دل ہی سو غنی ہے

تن پروریٔ خلق مبارک ہو انھیں یاں
جوں نقشِ قدم اور ہی آسودہ تنی ہے

آگے جو بلا آتی تھی سو دل پہ ٹلی تھی
اب کے تو مری جان ہی پر آن بنی ہے

اے درد کہوں کس سے بتا راز محبت
عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

---

(۱) دنیا کی ہر راحت کے متعاقب کلفت ہے۔ ہر میلا بچھڑنے والا ہے۔ ہر چمن اجڑنے والا ہے۔ یہی مضمون شاعر نے باندھا ہے۔ ورلے اچھوتی مثال کے ساتھ۔ پلکوں کا ملنا سکون۔ آسائش اور خوابِ راحت کے مترادف ہے۔ لیکن اس کے بعد انسان کی آنکھ کھلتی ہے۔ اور وہ چونکتا ہے۔

جاگ اُٹھتا ہے اور یہ بزم مژگاں درہم و برہم ہو جاتی ہے۔

آتشِ عشق جی جلاتی ہے (۱) یہ بلا جان ہی پر آتی ہے
تو ہے اور سیرِ باغ ہے ہر وقت داغ ہیں اور میری چھاتی ہے
شام بھی ہو چکی کہیں اب تو آشتابی کر رات جاتی ہے
کچھ مناسب نہیں ہے کیا کہئے جی میں جو جو کچھ اپنے آتی ہے
ٹک خبر لے کہ ہر گھڑی ہم کو اب جدائی بہت ستاتی ہے
درد اس کو بھی دید کر لیجے
نوجوانی یہ مفت جاتی ہے

---

(۱) توہم ہے کہ بلا کسی نہ کسی عزیز چیز پر آتی ہے۔ مثلاً جان۔ مال عزت اور اُس کی بھینٹ لے کر ٹلتی ہے۔ شاعر کی رائے میں بلائے عشق وہ بلا ہے جو ہمیشہ جان پر آتی ہے اور جان لے کر جاتی ہے۔

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے (۱) تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
لے خبر تیغِ یار رکھتی ہے باقی اس نیم جان میں کچھ ہے
ان دنوں کچھ عجب ہے میرا حال دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے
اور بھی چاہئے سو کہئے اگر دلِ نامہربان میں کچھ ہے
درد تو جو کرے ہے جی کا زیان
فائدہ اس زیان میں کچھ ہے

(۱) ہمہ اوست

آرام سے کبھو نہ یک بار سو گئے (۱) ایسے ہمارے طالعِ بیدار سو گئے
خواب عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے (۲) آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے
اٹھتی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے
تیری گلی ہے یا کوئی آرام گاہ ہے (۳) رکھتے قدم کے پاؤں تو ہر بار سو گئے
وہ مر چکے جو رونقِ بزمِ جہان تھے
اب اٹھئے دردؔ یاں سے کہ سب یار سو گئے

(۱) طالع بیدار ایسے سوئے کہ پھر ہم کو سونا نصیب نہ ہوا۔ (صنعت تضاد)
(۲) دیدار کی تلاش میں انسان اب آباد سے دنیا میں آیا۔ جب در مقصود یہاں بھی نہ پایا تو پھر وہیں واپس چلا گیا۔
(۳) پاؤں سو جانا۔ بمعنی پاؤں سن ہو جانا۔ نیز آرام گاہ میں انسان سوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کوئے یار میں پاؤں سو جاتے ہیں۔ شل ہو جاتے ہیں۔ اٹھتے نہیں۔ یہ کوئے یار نہیں آرام گاہ ہے۔ نیز آرام گاہ معنی گورِ غریباں بھی فارسی میں مستعمل ہے۔

آج نالوں نے مرے زور ہی دلسوزی کی (۱) زخم دل جتنے تھے یاں سب کی جگر دوزی کی
دل پہ رہتی ہے چڑھی زلف کسو کی میرے (۱) اور تو کیا کہوں میں اپنی سیہ روزی کی
غیر بکتے ہیں عبث میرے پیا لے تیری (۳) بیوفائی نہیں محتاج بد آموزی کی
کیونکہ تشبیہہ ترے ساتھ اُسے دے کوئی شمع کو آتی نہیں طرح دل افروزی کی

شعر کی فکر بن آتی ہے اُسی سے جس کو
درد کی طرح کبھو فکر نہ ہو روزی کی

---

(۱) شاعر طنزاً کہتا ہے کہ نالوں نے ہمارے ساتھ آج بڑا سلوک کیا۔ سارے زخم دل خوب دل بھر کر سیئے

(۲) سیہ روزی۔ سیہ روزگاری۔ و سیہ بختی کے مترادف ہے

(۳) تو فطرتاً بے وفا دوست آزاد و آشنا کش ہے۔ اغیار بے کار تجھے لگائی بجھائی کرتے ہیں۔ تیرے کان بھرتے ہیں۔ تیری کج ادائی و بے وفائی ان باتوں سے مستغنی ہے

جوں سخن اب یاد اک عالم رہے ہے (۱) زندگانی تو چلی جا ہم رہے
تا ابد جوں قطرہ مجھ سا منفعل (۲) جس جگہ سجدہ کرے وہ نم رہے
بہ چلا آنکھوں سے دل ہو کر گداز منہ پہ آکر جم رہے تو جم رہے
رک نہیں سکتی ہیں یاں کی واردات (۳) کب یہ ہو سکتا ہے دریا تھم رہے
ہے زمانہ وہ کہ مثلِ آسماں (۴) جس کے آگے اہلِ رفعت خم رہے
ہم ہی نہیں اس وحشت صحرائے سے اداس اور بھی جو آئے سو یاں کم رہے
ہے محال عقل زیرِ آسماں (۵) حرص ہو جس دل میں وہ خرم رہے
کبک آتش کھا کرے یوں قہقہے (۶) چیونٹوں کے گھر سدا ماتم رہے

رکھ نفخت فیہ من روحی کو یاد
جب تلک اے درد دم میں دم رہے

---

(۱) زندگانی فانی سہی۔ لیکن ہماری ذات فنا ہونے والی نہیں۔ جس طرح آواز ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن بات کا مفہوم دماغ پر رہ جاتا ہے۔

(۲) مجھ سا شرمندۂ عصیاں جس جگہ سر جھکائے گا۔ وہ اس طرح نم رہے گی، جیسے وہاں پانی کی بوند گری ہو۔ قطرہ سر کے بل گرتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کے گرنے کو سجدے سے مشابہ کہا گیا۔

(۳) جس طرح دریا کا رکنا ممکن نہیں اُسی طرح واقعات وحوادثِ روزگار روکے نہیں جاسکتے۔

(۴) شاعر کہتا ہے سربلند زمانے کے روبرو سرِ نیاز خم کرتے رہے۔ آسمان کو دیکھ لو باوجود رفعت کے نہ صرف سر جھکاتا بلکہ اس خاکدان کے قدموں پر سر ٹکاتا نظر آتا ہے۔

۶ - ۵ - یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ شاعر اہلِ حرص کو غیر مطمئن اور اہل غنا کو خوش وخرم ثابت کررہا ہے۔ مثال میں کبک اور چیونٹوں کو پیش کرتا ہے۔ کبک کی آواز قہقہہ سے مشابہ باندھتے ہیں اور چیونٹوں کی سیاہی کو دلیلِ ماتم قرار دیا ہے۔ لیکن کبک آتش نہیں کھاتی۔ اسی قبیل کا ایک اور جانور ہے جس کو آتش خورہ کہتے ہیں نیز اس کی بھی طبعی غذا آگ نہیں۔ جب مست ہوتا ہے تو انگاروں پر ٹھونگ مارتا ہے۔ خانہ بدوش ایرانی قبائل کے پاس راقم الحروف نے خود دیکھا ہے۔

(۷) نفخت فیہ من روحی کلام پاک کی آیۃ ہے۔ معنی ہیں میں نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ اور یہ الفاظ انسان کی بابت کہے گئے ہیں یہ آیۃ انسان کو جو خدا سے نسبت ہے اس پر دلیل ہے۔

بلبل نہ برائے باغباں سے (۱) گل کا بھی چلے نہ کچھ خزاں سے
لیتے ہیں مژہ سے کام ابرو یہ تیر ملے نہ گو کماں سے
جوں غنچہ وبالِ دل ہے غافل (۲) ہر خندہ کہ نکلے ہے وہاں سے
مانند صبا تری گلی میں جو کوئی گیا پھرا نہ وہاں سے
ہیں سیف زباں تیرے سیہ مست (۳) کہہ ساغرِ چشم دل ستاں سے
وہ ہیں وہ ہوا قلم کی مانند (۴) جو حرف نکل گیا زباں سے
شبنموں کے لئے فلک پھرے ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں سے
ہر آن ہے واردات دل پر آتا ہے یہ قافلہ کہاں سے
بدنام کرے ہے دخترِ رز مغ اس کو نکال اپنے یاں سے

ہے مثلِ چراغ درد میرا
(۵) دشمن دمِ عیسوی ہے جاں سے

---

(۱) نہ باغباں پر بلبل کا حکم چلتا ہے نہ گل کا خزاں پر کوئی زور مدعا یہ کہ ہر شے مجبور و ناچار ہے۔

(۲) ہونٹ سرگرمِ تبسم ہوتے ہیں اور دل پر آفت آتی ہے۔ غنچے کو دیکھ لو لب مسکراتے ہیں۔ دل شق ہو جاتا ہے۔

۴۔۳۔ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ سیف زبان، زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں۔ جس کا کہا ٹلے نہیں۔ قلم کی مانند۔ یعنی لوح و قلم کی مانند جس کا لکھا قسمت کا لکھا ہے ہو کر رہے۔

(۵) دمِ عیسیٰ گو حیات بخش ہے۔ لیکن چراغ کے لئے وہ بھی وجہ ہلاکت۔

نہ ہاتھ اٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے — کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے
نہیں خیال مجھے خاتمِ سلیماں کا (۱) — برنگ نام ہوں برکندہ دل نگینے سے
سمان دانۂ انگور مے پرستوں نے — لیا ہے فیض مرے دل کے آبگینے سے
ترقی اور تنزل کو یاں کے کچھ عرصہ — مثالِ ماہ زیادہ نہیں مہینے سے
مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے
مآلِ کار سمجھایا ظفر نے ہمکو — یہ نقد مال لگا ہاتھ اس دفینے سے

لبسا ہے کون ترے دل میں گلبدن اے درد
کہ بو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

---

(۱) ہم کو خاتمِ سلیماں کی خواہش نہیں۔ ہم نام کی مانند نگینے سے برکندہ دل و برداشتہ خاطر ہیں۔ اس شعر میں حل طلب نگینے سے نام کی مانند برکندہ دل ہونا ہے۔ نام کو جب نگین پر کھودا جاتا ہے تو پہلے اس پر سیاہی سے نام لکھ لیتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ تراشنا، کھودنا اور اکھیڑنا شروع کرتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں کہ جو نام نگینے پر لکھا گیا تھا۔ اس کو وہاں سے کھود کر نکال دیا گیا۔ یعنی برکندہ کر دیا۔ نکال پھینکا۔

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی — ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی
دیدو وا دید تو ہوئی دور سے میری اسکی — پر جو میں چاہا تھا سو بات نہ ہونے پائی
کون وہ بے سرو ساماں ہے کہ یارب جز اشک — جس کی خاطر کہیں برسات نہ ہونے پائی

قطعہ

اُٹھ چلے شیخ جی تم مجلس رنداں سے شتاب
ہم سے کچھ خوب مدارات نہ ہونے پائی
جی میں منظور تھی جو آپ کی خدمتگاری
سو تو اے قبلۂ حاجات نہ ہونے پائی
جی فنا ہو ہی گیا اِک نگہِ گرم کے ساتھ
دردؔ کچھ اور عنایات نہ ہونے پائی

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے
گو سراپا ہے آب آئینہ
اپنی آنکھوں میں چشم بے نم ہے
دل پُر چاک سے گُل خنداں
شادی و غم جہاں میں توأم ہے
دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے
دونوں عالم کا ایک عالم ہے
خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں وہ زہر
(۲) سانپ کی زیست ہے تجھے سم ہے
مت عبادت پہ بھولیو زاہد
(۳) سب طفیلِ گناہِ آدم ہے
سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف
جس کے ہاتھ آوے جام سو جم ہے
اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن
جو شجر ہے سو نخلِ ماتم ہے
نہ ملیں گے اگر کہے گا تو
تیری خاطر ہمیں مقدم ہے
دلِ عاشق کی بے قراری کو
وہ ہی سمجھے ہے جو کہ محرم ہے
دردؔ کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہ ہی رونا ہے نت وہی غم ہے

---

(۱) آنکھوں میں۔ بمعنی رائے میں۔ خیال میں۔ آئینہ گو سرتاپا آب ہے، لیکن چشم بینا کے نزدیک چشم بے نم سے زیادہ نہیں۔ اور چشم بے نم مردہ قابل

ردو نظر اندازی۔

(۲) دُنیا کی کوئی شے نہ محض خراب ہے نہ بالکل اچھی۔ موقعہ اور محل کی مناسبت سے حکم لگایا جاتا ہے۔

(۳) اے زاہد اپنی عبادت پر غرور نہ کر اس کی بنا گناہِ آدم پر ہے نہ حضرت آدم گناہ کرتے۔ نہ دنیا تکمیل ہوتی نہ موجودہ عبادت کا سلسلہ شروع ہوتا۔

دل مرا باغِ دلکشا ہے مجھے
دیدہ جام جہاں نما ہے مجھے

چشمِ نقشِ قدم ہوں میں بیکس
(۱) خاک آنکھوں میں طوطیا ہے مجھے

مجھ سے ہر چند تو مکدّر ہے
تجھ سے پر اور ہی صفا ہے مجھے

کہیں خاموش ہو کر مثل شمع
(۲) اے زباں تجھ سے ہی گلا ہے مجھے

پاؤں لرزے ہے مست کے مانند
شیشہ مے بھرا ملا ہے مجھے

درد تیرے بھلے کو کہتا ہوں
یہ نصیحت سے مدعا ہے مجھے

ورنہ ان بے مروتوں کے لئے
اور بھی ہو خراب کیا ہے مجھے

---

(۱) میں خاک افتادہ چشم نقش پا کی مانند ہوں۔ انحصارِ حیات خاک پر ہے۔ اسی کو آنکھوں سے لگاتا ہوں۔

(۲) شمع کو اپنی زبان سے شکایت ہے اور انسان کو بھی۔ شمع کو اس لئے کہ زبان اُسے جلا رہی۔ اور انسان کو یا عاشق کو اس لئے کہ زبان نے اظہارِ عشق کر دیا۔ مدعائے دل کہدیا۔ معشوق کو برہم کر دیا۔

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اُس سے — مذکور کسی طرح تو جا کیجئے اُس سے
جوں جوں وہ گھٹے ہی تو یہی آئے ہے جی میں (۱) — پھر چھیڑیئے اور باتیں سنا کیجئے اس سے
سو مرتبہ یوں ٹھہر چکی اب سے نہ ملئے — وہ وں بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اس سے
بیزار اگر مجھ سے ہو مختار ہو بہتر — دل جس سے ملے اپنا ملا کیجئے اس سے

ہم کہتے نہ تھے درد میاں چھوڑ یہ باتیں
پائی نہ سزا اور وفا کیجئے اس سے

---

(۱) باتیں سننا۔ محاورے میں بُرا بھلا سننے کے معنی دیتا ہے۔

سرسبز تھا نیستاں میرے ہی اشکِ غم سے (۱) — تھے سینکڑوں ہی نالے وابستہ ایکدم سے
واقف نہ یاں کسو سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے — یعنی کہ آگئے ہیں بہکے ہوئے عدم سے
ہیں گو نہیں ازل سے پرتا ابد ہوں باقی (۲) — میرا حدوث آخر جا ہی بھڑا قدم سے
گر چاہیئے تو ملیئے ور چاہیئے نہ ملیئے — سب تم سے ہو سکے ہے ممکن نہیں تو ہم سے
مشتاق گر ترا کچھ لکھے تو کیا عجب ہے (۳) — ہوں مثل نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے
ہر چند یہ تمنا درخور نہیں ہمارے — نزدیک تو جو آوے کیا دور ہے کرم سے
اب ہیں کہاں وہ نالے سرگشتگی کدھر ہے — تھیں سب وہ باتیں ثابت میرے ہی دم قدم سے
ہے اک نگاہ کافی گو ہوئے گاہ گاہی — چنداں نہیں ہے مطلب عاشق کو بیش و کم سے
کاہے کو ہوتی ہم کو گردش نصیب طالع (۴) — گر پاؤں باہر اپنا رکھتے نہ ہم عدم سے
آتے ہیں دام میں کہ خورشید رو کسو کے (۵) — اے شیخ یہ نہیں ہیں تسبیح کے یہ منکے

ہے درد پر بھی کچھ تو میری ہی سی مصیبت
گھیرے ہے اور ہی غم چھوٹے جو ایک غم سے

(۱) اس شعر میں نالے دو معنی دے رہا ہے۔ ایک آہ و نالے۔ دوسرے ندی نالے جن کا کام سرسبز کرنا ہے۔ نیز نے کو آہ و نالے سے تعلق بھی ہے اس لئے کہ اس سے نے یا بانسری بنائی جاتی ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند

(۲) انسان کا وجود ازل میں نہ تھا۔ بعد میں عالم وجود میں آیا۔ لیکن جب ایک مرتبہ پیدا کر دیا گیا تو اب ابد تک رہے گا۔ یعنی ہمیشہ۔ شاعر کہتا ہے کہ ابتدا میں صرف وہی ذات واحد تھی لیکن ہستی انسانی جب ایک مرتبہ تخلیق ہو گئی اور نفخت فیہ من روحی کے تحت اس ذات سے متعلق تو اب لافانی ہے ہمیشہ سے نہیں ہے۔ لیکن اب ہمیشہ رہے گی۔

(۳) انتہائے اشتیاق دید (قلم اور نرگس مراعات النظیر)

(۴) شاعر اپنی قسمت سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر اس دنیا میں نہ آتے تو اس چکر میں نہ پڑتے۔ غالب نے کہا ہے ع

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

(۵) "شمسے" پان کی ایک چیز ہوتی ہے۔ جو ہاروں میں اکثر ڈالی جاتی ہے۔ اگلے وقتوں میں خوبصورتی کے لئے تسبیح میں بھی ڈالتے تھے۔ شاید اس دور میں تسبیح برائے زینت ہوتی تھی نہ برائے عبادت۔ بہر نوع شمسے پروئے جاتے تھے اور رشتے کے جال میں پھنس جاتے تھے۔ شاعر خورشید رو کی مناسبت سے شمسے لایا ہے

مزاجی ہے جب تک تری جستجو ہے — زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے
خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا — میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا | تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
کیا سیر سب ہم نے گلزار دنیا | گلِ دوستی میں عجب رنگ و بو ہے
غنیمت ہے یہ دید وا دیدِ یاراں | جہاں آنکھ مند گئی نہ میں ہوں نہ تو ہے
نظر میرے دل کی پڑے درد کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے | (۱) اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
اے گل تو رخت باندھ اٹھاؤں میں آشیاں | گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے
رہتی ہے کوئی بن کئے میرے تئیں تمام | (۲) جوں شمع چھوڑنے کی نہیں یہ زباں مجھے
پتھر تلے کا ہاتھ ہی غفلت کے ہاتھ دل | (۳) سنگِ گراں ہوئی ہر ہر خواب گراں مجھے
کچھ اور کنجِ غم کے سوا سوجھتا نہیں | آتا ہے یاد جب کہ وہ کنج وہاں مجھے
جاتا ہوں خوش دماغ جو سُن کر اُسے کبھو | (۴) ملتے ہے وہیں نظر پڑے دیکھا جہاں مجھے
جاتا ہوں بسکہ دمبدم اب خاک میں ملا
(۵) ہے خضرِ راہ دردِ دیریگِ رواں مجھے

---

(۱) پیش رفتگان نقشِ پا چھوڑ جاتے ہیں اور بعد میں آنے والے اُن کو ٹھکراتے گذر جاتے ہیں۔ چونکہ وہ خاک افتادہ ہوتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے عمر کا اچھا دور اپنی روانی میں گذر گیا۔ اور سب مجھے مثل نقش پا لکت کوب روزگار کا شکار چھوڑ گیا۔

(۲) شمع کی لو زبانِ تصور کی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ شمع کو فنا کر دیتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بعینہٖ میری زبان بھی میرے لئے وجہ ہلاکت ثابت ہوگی۔ چونکہ

زبان سے اظہار مدعا ہوتا ہے۔

(۳) پتھر کے نیچے دبا ہوا ہاتھ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے دل پر جو غفلت کا بار ہے۔ اس نے اُسے از کار رفتہ کر دیا ہے۔

(۴) نظریں بدلنا، محاورہ ہے، ناراض ہونے خفا ہونے بے رُخی کرنے کے معنی ہیں۔

(۵) ریگ رواں۔ اڑنے والا ریت۔ صحرائی علاقوں میں ٹیلے کے ٹیلے اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں اور ذرّات مسلسل اپنا مقام بدلتے رہتے ہیں۔

---

(۱) جوں صدا نکلا ہی جاہے خانۂ زنجیر سے — کب ترا دیوانہ آوے قید میں زنجیر سے

(۲) جوہری واقف نہ ہوئے جوہر شمشیر سے — قدر مردوں کی سمجھنے کے نہیں یہ مایہ دار

(۳) جا بجا سب پشت پر دیوار ہیں تصویر سے — دیکھنا تو آ کے از خود رفتگان کا حال ٹک

جز خرابی کے بتا کیا فائدہ تعمیر سے — منعم ایسے قصر لاکھوں مل گئے ہیں خاک میں

درد اب ہنستے ہیں رونے پر مرے سب خاص عام
کیا ہوئے وہ نالے جو لگتے تھے دل میں تیر سے

---

(۱) عاشقانِ خدا دُنیا میں ہونے کے باوجود قیود دنیوی سے آزاد ہیں جس طرح آواز گو زنجیر میں ہے وہ اس میں مقید نہیں۔

(۲) لفظ جوہر پر سارے شعر کا انحصار ہے۔ جوہر۔ قیمتی پتھر کو بھی کہتے ہیں جس کے پرکھنے والے جوہری ہوتے ہیں۔ نیز جوہر تلوار میں بھی ہوتے ہیں جن سے جوہریوں کی نظریں آشنا نہیں۔

(۳) انسان جب عالم بے خودگی میں ہوتا ہے تو کسی نہ کسی شے کا سہارا

لیتا ہے تیرے جلوے نے دیدہ دروں کو حیران کر دیا اور وہ مانند تصویر دیوار کا سہارا لے کر ٹک گئے

ہمچشمی ہے وحشت کو مری چشمِ شرر سے (۱) آتی ہے نظر پھر وہیں غائب ہو نظر سے
اے ہم وطناں اب کے یہ غربت زدہ ہرگز (۲) پھرنے کا نہیں عمر کے مانند سفر سے
کیوں تیغ تری دشمنی کرتی ہے مرے ساتھ (۳) مجھ کو تو نہیں کام کسو کی بھی کمر سے
جاؤں میں کدھر جوں گلِ بازی مجھے گردوں (۴) جانے نہیں دیتا ہے اِدھر سے نہ اُدھر سے
کعبہ بھی بھلا شیخ ترے ساتھ چلیں گے (۵) ایدھر کو پھریں گے ہم اگر یار کے گھر سے
اس طرح کے رونے سے تو جی اپنا رکے ہے اے کاش یہ ابرِ مژہ دل کھول کے برسے
کھلتی ہے مری آنکھ جو احوال پہ اپنے (۶) جوں شمع گھٹا جاتا ہوں میں اپنی نظر سے
اے سنگ جو کچھ تو نے کیا شیشہ کے حق میں (۷) کرتا ہے کوئی بھی یہ سلوک اپنے جگر سے

---

(۱) ہم چشمی۔ یعنی مدِ مقابل ہونے کی آرزو۔ وحشت میں بہت کچھ شرر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً بے قراری گاہ طبیعت روشن گاہ تاریک۔ ابھی منبسط ابھی افسردہ۔

(۲) سفر آخرت مراد ہے۔

(۳) دوسرے مصرعہ میں "کمر" کے معنی مرتبے کے ہیں۔ شاعر کی مراد ہے کہ میں تو کسی کے مرتبے کا خواہاں نہیں۔ تیغ مرے درپے آزار کیوں ہے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تیغ کمر پر اپنا حق سمجھتی ہے۔ اس لئے کہ وہاں لٹکتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں تو کمر کا خواہاں نہیں پھر یہ تیغ کشیدہ کیوں ہے۔

(۴) پھولوں کی گیند بنا کر اس سے کھیلتے تھے۔ اور اس گیند کو گلِ بازی

کہا جاتا تھا۔ کھیلنے والے اسے اپنی طرف سے باہر نکلنے دینے میں ہار سمجھتے تھے اور وہ ٹینس کی گیند کی مانند ایک طرف سے دوسری طرف سرگرداں رہتی تھی اور اس چکر سے مفر نہ تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہی مثال آدمی کی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں انسان ایک گیند ہے جو ٹکراتا پھرتا ہے۔ پر نجات نہیں پاتا۔

(۵) کعبہ جانا عابدوں کا مسلک ہے اور تلاش یار صوفیوں کا مذہب۔ خواجہ میر درد آخر الذکر طریق پر پے سپر تھے۔ سو کہتے ہیں کہ اگر یار کے گھر یعنی خانۂ دل سے اگر واپس آئے تو کعبے جائیں گے۔ یعنی مقدم دل ہے۔

(۶) شاعر کہتا ہے کہ جب بھی اپنے پر نظر ڈالتا ہوں۔ نظروں سے گرا جاتا ہوں۔ مثال اس دعوے پر شمع سے روشنی ڈالتا ہے کہ جب آنکھ کھولتی ہے گھٹنے لگتی ہے۔ شمع کا آنکھ کا کھولنا اس کے روشن ہونے کے مترادف ہے۔ اور اس کا روشن ہونا اور گھٹنا لازم و ملزوم۔

(۷) بلور کان میں سے نکلتا ہے۔ اس نسبت سے پتھر کا جگر کہلایا۔

گر خاک مری سرمۂ ابصار نہ ہووے ۔۔۔ تو کوئی نظر قابلِ دیدار نہ ہووے

(۱) سر رشتۂ الفت ہے بُرا شیخ و برہمن ۔۔۔ یہ رشتہ بھر سبحۂ و زنّار نہ ہووے

گر قید ہی قسمت میں ہی کچھ اور رہو یارب ۔۔۔ پر دل کسو دل سے تو گرفتار نہ ہووے

پھر موت کسی طرح تو نزدیک نہ پھٹکے ۔۔۔ دنیا میں یہ جینے کا جو آزار نہ ہووے

دل ویسے ستمگار سے اظہارِ محبت ۔۔۔ ایسا کہیں پھر دیکھیو زنہار نہ ہووے

اگر زندگی اس طور سے لے درد جہاں میں
خاطر پہ کسو شخص کے تو بار نہ ہووے

---

(۱) سبحہ اور زنّار مذاہب کی علامتیں ہیں اور دونوں میں ڈورہ لازمی. تسبیح میں دانے روئے کے لئے اور زنّار محض ڈورہ ہی ہے. شاعر شیخ و برہمن سے کہتا ہے کہ ان نشانات مذہب کو بس ڈورے ہی تک رہنے دینا. بھول کر بھی رشتۂ محبت کو دخل نہ دینا ورنہ مشکل آن پڑے گی. تمھارے بس کا کام نہیں رہے گا۔ حالانکہ اصل مذہب محبت اخوت اور ہمدردی ہے. مراد یہ ہے کہ ان مذاہب کے متولیوں نے اصل مذہب کو ترک کر دیا ہے. فروعات کو لئے بیٹھے ہیں اور ان کی بزرگی و برتری ان سطحی چیزوں ہی سے قائم ہے۔

دیا ہے کس کی نظر میں یہ اعتبار مجھے (۱) کہ ایک دم بھی نہیں اپنے پاس بار مجھے
سوائے تیرے کسو سے نہیں ہے واشدیاں (۲) مثالِ آئینہ اے چشمِ انتظار مجھے
ہمیشہ اپنی نظر میں سبک میں رہتا ہوں دیا ہے اوروں کی نظروں میں گو وقار مجھے
کبھو ہی جی میں نہ گذرا خیال سرتابی (۳) برنگِ سایہ بنایا ہے خاکسار مجھے
تمھارے وعدہ بتاں خوب میں سمجھتا ہوں رہا ہے ایسے ہی لوگوں سے کاروبار مجھے
یہ کون برق تجلّی ہوا ہے آفتِ جاں کہ ایک دم نہیں جوں شعلہ اب قرار مجھے
جفا و جور تو ظالم سبھی گوارا ہیں مگر یہ رسم جدائی ہے ناگوار مجھے
یہ آپ ہی آپ کدھر تیوریاں بدلتے ہو دکھائیے تو سہی منہ بھی ایک بار مجھے

اس امر میں بھی بہ بے اختیار ہے بندہ
ملا ہے درد اگر یاں کچھ اعتبار مجھے

---

(۱) میں ایسا کس کی نظروں میں چڑھ گیا ہوں مقبول ہو گیا ہوں کہ اپنے

آپے میں نہیں آتا۔ خودی میں نہیں آتا۔

(۲) آئینے پر عکس پڑتا ہے۔ اس کے اندر تو کوئی جا ہی نہیں سکتا۔ مانند چشم انتظار ہے جو ہمہ وقت وا ہے اس میں آتا نہیں۔ اس ہی طرح میں بھی آغوشِ چشم وا رکھتا ہوں ولے اس میں سوائے تیرے کوئی نہیں آتا اور تجھ میں اور مجھ میں فرق نہیں۔

(۳) شاعر کہتا ہے کہ حکم عدولی کا خیال بھی کبھی میرے پاس نہیں آتا۔ مجھ کو تو سایے کی مانند خاکسار و منکسر المزاج بنایا ہے مجھے سرتابی سے کیا واسطہ۔ اس شعر میں کئی خوشنما پہلو ہیں۔ اول تو سایہ خود بے حس وحرکت ہوتا ہے۔ پس اس سے سرتابی ناممکن۔ نیز سایہ زمین پر پڑتا ہے اور یہ اس کی خاکساری کی دلیل ہے۔ علاوہ ازیں انسان مٹی سے بنایا گیا ہے یہ اس کی خاکساری و منکسر المزاجی پر برہان ہے۔ نیز اکثر فلاسفہ کے نزدیک خصوصاً افلاطون کی رائے میں یہ دنیا عالم عکس ہے اس اعتبار سے بھی انسان کی حیثیت سایے سے زیادہ نہیں۔

(۴) اس شعر میں اعتبار کے معنی مرتبت و منزلت کے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن اپنے کیے دھرے نہیں احسن التقویم بھی اس ہی کے کرم سے ہے اور اسفل السافلین بھی اس ہی کا بنایا ہوا۔

فرض کیا کہ اے ہوس اک دو قدم ہی باغ ہے
آپ کہیں کو اٹھے سو کب یہ دل و دماغ ہے
دیکھیے جس کو یاں اُسے اور ہی کچھ دماغ ہے (۱)
کر مکِ شب چراغ بھی گو ہر شب چراغ ہے

غیر سے کیا معاملہ آپ ہی ہیں اپنے دام میں
قیدِ خودی نہ ہو اگر پھر تو عجب فراغ ہے
حال مرا نہ پوچھئے ہیں جو کہوں سو کیا کہوں
دل ہے سوز ریش ہے سینہ سو داغ داغ ہے
کھو نہ سکے کبھو خمار میرے نشے کی آبرو (۲)
دیدۂ آئینہ کی طرح تجھ سے بھرا ایاغ ہے
سنتے ہیں یوں کہ آہ تو ہم ہی میں چھپ رہا کہیں
اپنی تلاش سے غرض ہم کو ترا سراغ ہے
غفلتِ دل ہوئی مگر پنبۂ گوش خلق ورنہ
بلبلِ داستاں سرا ورنہ ہر ایک زاغ ہے

---

(۱) نہ پوچھ حلقۂ عارفاں میں بیٹھنے والوں کی سربلندیاں نہ پوچھ. یہاں کا جگنو بھی گوہر شب چراغ پر چشمک زن ہے۔

(۲) جب نشہ اترتا ہے تو خمار ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے. ہمارا نشہ اترتا ہی نہیں جو خمار ہو۔ ہمارا تو ساغر دل تیری یاد سے آئینے کی مانند سدا بھرا رہتا ہے۔ آئینے میں آب ہوتی ہے اسی مناسبت سے بھرا ہوا جام کہا. نیز اس کی آنکھ کبھی خالی نہیں رہتی. سدا کسی نہ کسی شے کا جلوہ اپنے میں لئے رہتی ہے. پس اس کا ایاغ چشم سدا بھرا رہتا ہے۔

(۳) اگر غفلت کی روئی کانوں میں نہ ہو تو کوا بھی بلبل کا ہم صفیر معلوم ہوتا ہے مدعا یہ کہ غفلت کے پردے حائل نہ ہوں تو ہر شے میں دیدار خدا ہی نظر آوے۔

اپنے تئیں تو ہر گھڑی غم ہے الم ہے داغ ہے
یاد کرے ہمیں کبھی کب یہ تجھے دماغ ہے
جی کی خوشی نہیں اگر دسبزہ و گل کے ہاتھ کچھ (۱)
دل ہو شگفتہ جس جگہ وہ ہی چمن ہے باغ ہے
کس کی یہ چشمِ مست نے بزم کو یوں چھکا دیا (۲)
مثل حباب سرنگوں شرم سے ہر ایاغ ہے
جلتے ہی جلتے صبح تک گذری اسی تمام شب
دل ہے کہ شعلہ ہے کوئی شمع ہے یا چراغ ہے
پائیے کس جگہ بتا اے بتِ بیوفا تجھے
عمر گذشتہ کی طرح گم ہے سد اسراغ ہے
سیر بہار و باغ سے ہم کو معاف کیجئے
اس کی خیال زلف سے درد کسے فراغ ہے

---

(۱) خوشی و مسرت دل کے ساتھ ہے۔ باغ و راغ سے وابستہ نہیں۔ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔ اور مسرت آفریں دل کنج تنہائی میں بھی مجلس آرائیاں کر لیتا ہے۔ قلب حزیں بزم عیش میں بھی سرگرم فغاں رہتا ہے۔

شریک بزم عشرت ہوں مگر خاطر مکدر ہے
دہانِ زخم ہوں ہنسنا مرا رونے سے بدتر ہے

دل درد آشنا گلستاں میں بھی خلشِ خار محسوس کرتا ہے۔ گلوں کو دیکھ کر داغِ کہن ہرے کرتا ہے۔ اور پر از مسرت دل نوکِ خار پر بھی مثلِ قطرۂ شبنم رقصاں نظر آتا ہے پس جب اور جہاں دل خوش ہو وہیں بزمِ عیش ہے عیش و انبساط نام ہے دل کی خوشی کا۔

(۲) پہلے مصرعہ میں لفظ "جھکا دیا" ہے۔ اس کو چھکا دیا بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ معنی دونوں طرح پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن چشم مست کا کام محفل چھکانا ہے جھکانا نہیں۔ بہرکیف پہلے ہم جھکانا سے معنی کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے ایسا کون سا مخمور چشم معشوق تھا جس نے ساری محفل کو سرور گریباں کر دیا۔ حتےٰ کہ ایاغ

بھی حباب دار سرنگوں ہیں۔ لیکن اس معنی میں ایاغ کی وجہ شرمساری ظاہر نہ ہوئی۔ شعر تشنہ رہ گیا۔

اب چھکا دیا ہے معنی کیجئے۔ یہ کس کی چشمِ خمار آلود نے بزم کی طرف نگہِ غلط انداز ڈالی کہ سب کو مخمور سرشار کر دیا۔ جو کام ایاغ کا تھا وہ چشمِ مست بدرجۂ اتم انجام دے گئی اس شرمساری سے ایاغ حباب دار سرنگوں ہیں۔ نیز ایاغ کا سرنگوں ہونا ایک طرف تو اس کی شرمساری دکھا رہا ہے۔ دوسری طرف اس تک کے جھک جانے اور خمار آلود ہونے کی دلیل ہے۔ اور چشمِ مست کا انتہائے کمال۔

لحظہ بہ لحظہ یاں نیا داغ پر اور داغ ہے (۱) تو بھی اُدھر نگاہ کر ساحتِ سینہ باغ ہے

تیری نگاہِ مست نے جب سے یہ کی ہے میکشی (۲) خون سے اپنے مثلِ گل ہمنے بھرا ایاغ ہے

دولت فقر کے حضور گرد ہے جاہ سلطنت کہتے ہیں جس کو یاں ہما اپنی نظر میں زاغ ہے

اس کے خیال زلف نے سب سے ہمیں چھڑا دیا گرچہ پھنسے ہیں دام میں دل کے تئیں فراغ ہے

ہم نے بہت کہا اُسے پر نہ ہوا یہ آدمی زاہدِ خشک بھی کوئی سخت ہی خر دماغ ہے

اہلِ نظر کو رہنما (۳) درد نہیں ضرور کچھ
مثلِ شرر وہی ہے چشم اور وہی چراغ ہے

---

(۱) ساحت بمعنی میدان۔

(۲) جب سے تیری چشمِ مست نے مے آشامی شروع کی ہے ہم جیسے بے برگ دنوا اپنے خون سے جام بھرے کھڑے ہیں۔

(۳) اہلِ بصیرت کو خضر راہ درکار نہیں وہ اپنی راہ خود پیدا کرتے ہیں۔

دل کی روشنی میں منازلِ معرفت طے کرتے ہیں۔ شعر کو دیکھ لو اس کے واسطے چشم بھی ہے۔ چراغ بھی

پھنسئے کسی کی زلف میں کب یہ ہمیں فراغ ہو (۱) کیجئے بو شمیم بھی سو بھی کہاں دماغ ہے
شعلۂ دل کو ہر گھڑی لے دم یاس مت بجھا (۲) اپنی بساط میں تو یاں ایک یہی چراغ ہے
ہووے رقیب روسیہ آپ کے ساتھ جا بجا کچھ بھی ہے ربط سمجھئے ہمرہ کبک کے زاغ ہے
قصد ہے جس طرح بنے پہونچئے آپ تک کہیں دن بھی یہی ہے جستجو رات یہی سراغ ہے
درد وہ گلبدن مگر تجھ کو نظر پڑا کہیں
آج تو اس قدر بتا کس لئے باغ باغ ہے

---

(۱) بو کیجئے۔ یعنی سونگھئے۔

(۲) صوفیہ کے مذہب میں روشنی قلب خضر راہ طریقت ہے۔ شاعر نا امیدی اور یاس سے کہہ رہا ہے کہ اس کو نہ بجھائیو۔

پہلو میں دلِ تپاں نہیں ہے ہر چند کہ یاں ہی یاں نہیں ہے
عالم ہو قدیم خواہ حادث (۱) جس دم نہیں ہم جہاں نہیں ہے
ڈھونڈھے ہے تجھے تمام عالم ہر چند کہ تو کہاں نہیں ہے
عنقا کی طرح کیا بتاؤں جز نام مرا نشاں نہیں ہے
جوں شمع نہ راز دل کہوں گا (۲) ایسی بھی مری زباں نہیں ہے
وعدے پہ ہو کیونکہ یاں تسلی ہرگز یہ مجھے گماں نہیں ہے
فریاد کہ درد جب تلک میں (۳) تیار ہوں کارواں نہیں ہے

(۱) بعض فلاسفہ کے نزدیک دُنیا قدیم ہے۔ بعض اس کے خلاف ہیں، اور اسے حادث مانتے ہیں۔ خواجہ میر درد کہتے ہیں کہ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔ جب ہم فانی ہیں تو ہمارے لئے دنیا بھی فانی ہے۔ اُردو کی ایک مثال ہے۔ زبان کی غلطی نظر انداز کر دیجئے۔ آپ مردم جہاں مردم۔

(۲) زبانِ شمع یعنی اس کی لو طپشِ قلبِ شمع کی خبر دے رہی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری زبان سوزِ دروں ظاہر نہیں کرے گی۔

(۳) شاعر کہتا ہے کہ جب تک کہ میں رختِ سفر اور زادِ راہ تیار کروں کاروانِ حیات کوسِ رحیل بجا دیتا ہے

عشق ہر چند مری جان سدا کھاتا ہے (۱) پر یہ لذت تو وہ ہے جی ہی جسے پاتا ہے

آہ کب تک میں بکوں تیری بلا سنتی ہے — باتیں لوگوں کی جو کچھ دل مجھے سنواتا ہے

ہمنشیں پوچھ نہ اُس شوخ کی خوبی مجھ سے — کیا کہوں تجھ سے غرض جی کو مرے بھاتا ہے

بات کچھ دل کی ہماری تو نہ سلجھی ہم سے — آپ ہی خوش ہووے ہے پھر آپ ہی گھبراتا ہے

جی کڑا کر کے ترے کوچے سے جب جاتا ہوں — دلِ دشمن یہ مجھے گھیر کے پھر لاتا ہے

راہ پینڈی کبھو اُس شوخ کے تئیں ہم سے بھی (۲) دید وا دید تو ہوتی ہے جو مل جاتا ہے

درد کی قدر مرے یار سمجھنا واللہ
ایسا آزاد ترے دام میں یوں آتا ہے

---

(۱) عشق وبالِ جان ہے، پر دل اس میں مزا لیتا ہے۔

(۲) پینڈی۔ بمعنی تھی۔ حاصل نہی، پنجابی میں اب تک مستعمل ہے۔

یہ تحقیق ہے یا کہ افواہ ہے (۱) کہ دل کے تئیں دل سے یاں راہ ہے
اگر بے حجابانہ وہ بت ملے غرض پھر تو اللہ ہی اللہ ہے
عدم رفتگاں کو جو کہنا ہے کچھ (۲) تو قاصد ہمارا سرِ راہ ہے
نہ یاں علم و دانش نہ فضل و ہنر فقط ایک دل ہے کہ آگاہ ہے
گئے نالہ و آہ سب ہم نفس (۳) دم سرد ہی اک ہوا خواہ ہے
خدا اس کو رکھے سلامت رہے (۴) خبر گیر دل گاہ بے گاہ ہے
یہ کیا درد دُنجھ پر مصیبت پڑی
کہ دن رات نالہ ہی اور آہ ہے

---

(۱) دل را بدل رہیست۔ امر واقعی ہے یا کہنے کی بات ہے۔ چونکہ ہم کو تجربہ اس کے خلاف بتاتا ہے۔

(۲) اگر گذشتگاں سے کچھ کہلوانا ہے تو ہم سے کہدو۔ ہم اُدھر جانے والے ہیں پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ جان کا قاصد جانے کو ہے۔

(۳) ہوا خواہ بمعنی دوست۔ بھلا چاہنے والا۔ ہم نفس۔ دم۔ ہوا خواہ۔ نالہ و آہ کا آنا صنعت مراعات النظیر۔

(۴) گو معشوق دل کی خبر گیری گاہ گاہ کرتا ہے۔ ہمیشہ نہیں۔ تاہم دست بدعا ہوں کہ وہ سلامت رہے۔ یعنی گاہے گاہے پوچھنا بھی مغتنم ہے۔ اس کے بعد یہ بھی نہیں۔ نیز ایک معنی یہ بھی کئے جا سکتے ہیں۔ کہ دل کو خدا سلامت رکھے گاہ گاہ ہماری خبر گیری و دست گیری کر لیتا ہے۔ صوفیہ کی رائے میں دل ہی خضر راہ ہے۔

دشنام دے ہے غیروں کو تو جان کر مجھے — پیارے یہ لطف کیجئے پہچان کر مجھے
کل کی طرح سے آج بھی اب نیند آچکی (۱) — گھیرا اُسی خرابی نے پھر آن کر مجھے
کہتا ہے اک نگاہ پر آئینہ رو مرا — بس اور اب زیادہ نہ حیران کر مجھے
آنا یہ بندہ خانہ اگر تجھ کو عار ہے — دولت سرا میں اپنے ہی مہمان کر مجھے
ہوں روبروئے چشم تو ہیں سرمہ در گلو (۲) — پر کہیو زلف سے نہ پریشان کر مجھے
صدقے ترے میں کب تئیں تڑپا کروں عبث — ہے روز عید آج تو قربان کر مجھے

ہیں شعر فہم جتنے زمانے میں لاعلاج
(۳)
اے درد مانتے ہیں یہ سب آن کر مجھے

---

(۱) کل سے مراد روزِ ازل۔ آج بمعنی دُنیا۔ شاعر کہتا ہے کہ نہ ازل میں سکون ملا اور نہ دنیا میں۔ وہاں بھی سوزِ عشق تھا۔ یہاں بھی ساتھ ساتھ آیا۔ اب نیند آچکی۔ یعنی اب نیند نہیں آئے گی۔

(۲) سرمہ در گلو ہونا۔ آواز نہ نکلنا۔ گلا بیٹھ جانا۔ کچھ نہ کہہ سکنا۔ مانا کہ چشم کے روبرو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن زلف سے کہدو کہ زیادہ آگے نہ بڑھے۔ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ روبرو۔ گلو۔ چشم۔ سرمہ زلف و پریشان۔ مراعات النظیر۔

(۳) لاعلاج۔ بمعنی مجبوراً۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اہل سخن کو مسلم الثبوت اُستاد ہونا زورِ سخن سے منواتا ہوں۔ رعایت سے نہیں۔

یاں غیب کے جلوے کے تئیں جلوہ گری ہے (۱) — جو شخص کہ گذرے ہی نظر سے نظری ہے
گر نازکی عشق تجھے رنگ دکھاوے (۲) — ہر سنگ میں شیشہ ہی بھر شیشہ پری ہے

جوں شیشۂ ساعت ہیں تنگ ظرف جہاں کے (۳) واں دل ہیں کدورت سے تو یاں باد بھری ہے
سو طرح سے دیتے ہیں اُسے ہیچ ہنر مند مجھ سے نہیں ملتا یہ مری بے ہنری ہے
دل تنگ ہے یہ غنچۂ دل منہ نہ کھلا نا (۴) جوں نکہت گل اس میں تری پردہ دری ہے
ہے جوں مہ و خورشید زر و سیم میسر (۵) تو بھی تو حریصوں کی طرح در بدری ہے

لیتا ہے خبر وہ تو سبھی خلق کی لیکن
اپنے تئیں اے درد بہت بیخبری ہے

---

(۱) "نظری" کے دو معنی ہیں۔ ایک تو شاعری کی اصطلاح میں نظری اس شعر کو کہتے ہیں جو قابل نظر اندازی ہو۔ دوسرے "نظری" کے معنی غور طلب کے ہیں۔ پہلے ہم اول الذکر معنی کو لے کر شعر کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہماری نگاہوں میں کسی اور ہی کا جلوہ سما رہا ہے۔ باقی دنیا کی ہر شخصیت ہماری نظر میں لائق نظر اندازی ہے۔

دوسرے معنی یہ ہوئے کہ ہر شئے میں ایک اور ذات بزرگ جلوہ فرما ہے اور دنیا کی ہر چیز قابل غور۔

(۲) دوسرے مصرعہ میں پہلے شیشے سے مراد معمولی شیشہ ہے۔ جو پتھر سے نکالا جاتا ہے اور دوسرے شیشے سے مراد شیشۂ مے ہے۔ شاعر کا مدعا یہ ہے اہل نظر و اہلِ عرفان کو دُنیا کی ہر بُری بھلی شے میں دیدارِ خدا نظر آتا ہے۔

(۳) شیشۂ ساعت کو تنگ ظرف تو اس وجہ سے کہا گیا کہ ایک خاص مقدار کے بعد اس میں گنجائش نہیں رہتی۔ نیز اس کے دل میں کدورت اس سبب سے کہی کہ ریت بھری ہوتی ہے۔ شاعر دُنیا کے تنگ حوصلہ لوگوں کو

شیشۂ ساعت سے ملا رہا ہے اور کہتا ہے کہ شیشۂ ساعت میں اگر ریت بھری ہے تو ان کے دلوں میں باد۔ یعنی بادِ غرور نے جگہ کر رکھی ہے۔

(۴) "منہ کھلانا" یا "منہ کھلوانا" محاورے میں جرأت سخن و گفتار دینے کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً آپ نے اس چھوکرے کا اپنے پر بہت منہ کھلوا رکھا ہے۔ یعنی اپنی جناب میں گستاخ کر رکھا ہے۔ نیز اگر کوئی شخص خموش بیٹھا ہو اور بات ٹال رہا ہو تو وہ کہہ سکتا ہے۔ دیکھیے میں اتنی دیر سے گئی کر رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ میرا منہ نہ کھلوائیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح غنچے کے کھلنے سے بوئے گل چمن میں پھیل گئی اور بیرونِ چمن پہونچ گئی اس ہی طرح اگر میرا غنچۂ دل وا ہوا تو رازِ عشق عام ہو جائے گا۔

(۵) مہ و خورشید کی خصوصیت ہے کہ دربدر پھرتے ہیں۔ اول تو یہ دونوں گردش میں رہتے ہیں۔ دوسرے ان کی روشنی ہر جگہ پہونچتی ہے۔ مہ و خورشید صاحب زر و سیم ہونے کے باوجود تگ و پو میں ہیں۔ اس ہی طرح حریص دولت مند ہو کر بھی پریشان روزگار رہے و پریشانِ خاطر۔

مجھ کو تجھ سے جو کچھ محبت ہے
یہ محبت نہیں ہے آفت ہے

لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو
میں جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

بند احکام عقل میں رہنا
یہ بھی ایک نوع کی حماقت ہے

ایک ایمان ہے بساط اپنی
نہ عبادت نہ کچھ ریاضت ہے

آ پھنسوں میں بتوں کے دام میں یوں
دردؔ یہ بھی خدا کی قدرت ہے

---

(۱) میں مسجودِ ملائک و وجہ تکوینِ کون و مکاں ہونے کے باوجود بتوں کے جال میں پھنس جاؤں ۔ اسیر خواہشات دنیا ہو جاؤں ۔ یہ بھی اس ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے ۔

---

(۱) بلبلو کتنے ہی غنچے رازِ دل تہ کر گئے	گل اگر سنگہ ہو بعضے بھید کچھ کہہ کر گئے
پیش ازیں یک چند اس بستی میں ہم رہ کر گئے	چند مدت اب تم اے یارانِ آیندہ رہو
(۲) پر نہیں معلوم لختِ دل کدھر بہہ کر گئے	آنسوؤں میں کچھ جگر کے ٹکڑے ہیں بعض بعض
(۳) زعم میں اپنے سلاطین آپ کو شہ کر گئے	یہ نہ سمجھے اور ہی شاطر نے شہ دی تھی انھیں

کشتگانِ عشق کو ملیو خدا سے خوب داد
سخت صدمے یہ بتوں کی ہاتھ یاں سہ کر گئے

---

(۱) گل اپنا داغ دکھا گئے ۔ راز دل کہہ گئے ۔ دل کی لگی سنا گئے ۔ لیکن اے بلبلان غنچہائے ناشگفتہ پر غور کرو جو دل کی دل میں لئے چلے گئے ۔

(۲) آنسوؤں میں جگر کے تو ٹکڑے کہیں کہیں نظر آتے بھی ہیں ۔ لیکن دل کی خبر نہیں کہ وہ کدھر بہہ گیا ۔ سوال یہ ہے کہ دل کٹ کر بہنے کی خبر کیوں نہ ہوئی بات یہ ہے کہ دل ابتدائے عشق میں کٹ بہا اور اس وقت مجھ کو اس جذبے نے اس درجے بے ہوش و خود فراموش کر رکھا تھا کہ خبر تک نہ ہوئی ۔ نیز یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دل تھا ہی نہیں ۔ جو اس کے اثرات آنسوؤں میں نظر آتے وہ تو معشوق کے پاس چلا گیا تھا

(۳) سلاطین ، اصطلاح میں بادشاہوں کی اس اولاد کو کہتے ہیں جو وارثِ تاج و تخت نہ ہو ۔ معلوم ہوتا ہے یہ شعر خواجہ میر درد نے لال قلعہ کی خونی نوددگیر

سازشوں سے متاثر ہو کر کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سلاطین زعمِ باطل میں اپنی بساط مطابق دعوائے تاج و تخت کرتے رہے۔ اور یہ نہ سمجھے کہ شاطرِ فلک رخ بدل رہا ہے اور ہی چال چل رہا ہے۔ اُنھیں زچ کر رہا ہے۔ بساطِ ہستی اُلٹنے کو ہے۔ "شہ دینا" عام زبان میں کسی شخص کو غلط کام کی طرف اُبھارنے کو کہتے ہیں۔

شخص و عکس اس آئینے میں جلوہ فرما ہو گئے (۱) اُس نے دیکھا آپ کو ہم اُس میں پیدا ہو گئے
آئے تھے اس مجمعے میں قصد کر کے دور سے ہم تماشا کے لئے آپ ہی تماشہ ہو گئے
شیخ صاحب کچھ نہ پوچھو خلق ہو وہ پر فساد جس میں یاں اصلاح سے بھی فتنے برپا ہو گئے
آہ دے دے شخص جو دیتے تھے خبریں غیب کی ڈھونڈھتے پھرتے ہیں ان کو لوگ وہ کیا ہو گئے

دل ہی کچھ تنہا خفا ہو کر نہ یاں سے اٹھ گیا
ہم بھی تو اے درد چلنے کو مہیا ہو گئے

---

(۱) دُنیا عالمِ عکس ہے۔ خدا نے اپنا عکس آئینہ ہستی میں دیکھا۔ اور یہ عالم ایجاد و وجود میں آیا۔ یہ دُنیا مظہرِ الٰہی ہے۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان خدا کا عکس ہے۔

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے (۱) جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے (۲) ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا ایک دم آئے ادھر اُودھر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

آہ بس جی مت چلا تب جانیے | جب کوئی افسوں ترا اوس پر چلے
اک میں دلریش ہوں ویسا ہی دوست | زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں | (۳) چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے | (۴) شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے | (۵) وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے
ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے | ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے
جوں شرر اے ہستیٔ بے بود یاں | بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ | (۶) جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

---

(۱) شاعر طنزاً کہہ رہا ہے کہ انسان عصیاں شعار کے دنیا میں آنے کا جو مقصد تھا سو پورا ہو گیا۔ وہ اپنا اعمال نامہ سیاہ کر گیا۔ حالانکہ اس کو پیدا کرنے میں منشائے ایزدی کچھ اور ہی تھا۔

(۲) "مر چلے" یعنی برباد ہو گئے۔ نیز زندگی کا پایان کار بھی موت ہی ہے۔

(۳) "دامن تر" یعنی آلودۂ عصیاں۔ چشم تر یعنی گریاں۔ انسان بوقتِ پیدائش روتا ہے۔ سعدی کہتے ہیں کہ بوقتِ زادن تو ہمہ خنداں بذمدو تو گریاں

(۴۔۵) یہ دونوں شعر قطعہ بند معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے مظہرِ انوارِ خداوندی تو ہم خود ہیں۔ اگر وہ ذات کہیں مل سکتی ہے تو ہماری اپنی ذات میں مل سکتی ہے۔ مسجد و معبد میں نہیں۔ عابد و زاہد مدرسہ و خانقاہ میں تلاش کرتے ہیں۔ صوفیہ خانۂ دل میں۔ خواجہ میر درد کہتے ہیں عارف و سالک جب

بھٹکا تو خدا نے خود دستگیری کی اور بتایا کہ میں تجھ میں موجود ہوں تو مجھے ڈھونڈھنے کہاں جا رہا ہے

(۶) دنیا سرائے فانی ہے دو روزہ زندگانی ہے۔ بادۂ عرفاں کا دور چلتا رہے تو بہتر۔

بات جب آندآن ہوتی ہے (۱) تب کہیں تیرے کان پڑتی ہے
آتشِ عشق قہر آفت ہے ایک بجلی سی آن پڑتی ہے
آخر الامر آہ کیا ہو گا کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے
بات چڑھتی ہے دل پہ جو آخر خلق کی پھر زبان پڑتی ہے
میرے احوال پر نہ ہنس اتنا (۲) یوں ہی اے مہربان پڑتی ہے

شعر ہے اور درد ہے یعنے
بات میں اور ہی جان پڑتی ہے

---

(۱) بات جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ بچے بچے کو معلوم ہو جاتی ہے ہر فرد کی زبان پر آجاتی ہے۔ خلقِ خدا اس سے آشنا ہو جاتی ہے۔ تب کہیں آپ کے کان تک پہونچتی ہے۔ یعنی تب آپ کو خبر ہوتی ہے

(۲) پڑتی ہے۔ بمعنی آفت پڑتی ہے، بپتا پڑتی ہے، مصیبت پڑتی ہے۔

(۳) تخلص کو خوب بنا ہا ہے۔

اگ آن سنبھلتے نہیں اب میرے سنبھالے (۱) بے طرح کچھ ان آنسوؤں نے پاؤں لگائے
جو کچھ کہ دکھائے گا خدا دیکھیں گے ناچار صدقے ترے اک بار تو منہ اپنا دکھائے

ایسے سے کوئی اپنے تئیں کیونکہ بچائے
دل زلفوں سے بچ جائے تو آنکھوں سے چھپالے

وہ سرخ لباس اُس کے گلے میں نظر آیا
(۲) جس کے مرے دل میں پڑے اب تئیں لالے

کب تجھ پہ گذرتا ہے کبھی میرا سا احوال
یوں چاہے سو تو اور بھی کچھ باتیں بنالے

کیا جانیے کس دل کے تئیں آہ ڈسیں گے
زلفوں نے تو بے طرح یہ اب چھوڑے ہیں کالے

پھر آگے قیامت ہے اگر اب بھی نہ آؤ
مر رہتے جدائی کے دن اتنے تو ہیں ٹالے

ابرو نے ترے جس طرف اب تیغ سنبھالی
مژگاں نے وہیں گر دیے تب سامنے بھالے

وعدے کی تو مدت نہ کہی درد کچھ اُس نے
اس غم کو بھلا کہیے کوئی کب تئیں ٹالے

---

(۱) "پاؤں نکالنا" قابو سے باہر ہو جانا۔ بے جا حرکتیں کرنی۔

(۲) "لالے پڑ جانا" محاورہ ہے۔ مایوس ہو جانا۔ مثلاً اُن کی جان کے لالے پڑ گئے یعنی ان کی زندگی کی آس نہیں رہی۔ سُرخ اور لالے کا یک جا آنا مراعات النظیر ہے۔

(۳) جنتیوں سے خدا نے قیامت میں وعدۂ دیدار کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ قیامت کب آئے گی۔ نیز وعدے کی مدت آجانا، وعدے کا وقت آجانا۔ یا صرف وعدہ موت آجانے یا موت کا وقت آجانے کے معنی میں آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب وعدہ پورا ہوگا، یعنی موت آجائے گی۔ اس وقت غمِ روزگار سے نجات ملے گی۔ لیکن اس کی میعاد مقرر نہیں۔

غیر جو بے فائدہ ہاتھوں پہ گل کھایا گئے
(۱) ہم بھی ناحق داغ اپنے دل کے دکھلایا گئے

دل کی دل جانے مجھے شکوہ تو ملنے کا نہیں
(۲) گاہ گاہے پاس میرے آپ تو آیا گئے

دن تمھارے تو گئے ہائے خوشی سے ہر طرح
ہم بلا سے یاں پڑے راتوں کو گھبرایا کئے

دل بڑا ہوتا ہے کوئی تجھ سے پریوں ہی عبث
ہم سدا غیروں سے ملنا سن کے گھبرایا کئے

چین تو ہم کو نہ آیا ایک ساعت اس بغیر
رات دن ہر چند اپنے دل کو بہلایا کئے

دیکھنے پاتا نہیں ہے کوئی جس کی چھاؤں ہائیں
(۳) لے چلی ہے آج ہم کو وہ پری سایا کئے

اپنے دروازہ تلک بھی وہ نہ آیا ایک بار
ہر گھڑی اٹھ اٹھ کے ہم جس کیلئے جایا کئے

یا تو وہ راتیں تھیں یا تو یہ دنوں کا پھیر ہے
ہاتھ اب لگتے نہیں تب پاؤں دبوایا کئے

تب ہماری اسکی اب تک یوں نہ بھی تھی دردیاں
بات ایسی ویسی ہم خاطر میں کم لایا کئے

---

(۱) "گل کھانا" محاورہ ہے۔ دستور تھا کہ عشاق معشوق کی یاد میں اور اس کی نشانی کے طور پر اپنا جسم داغ لیا کرتے تھے۔ نیز اگر اس ستم پیشے کا چھلا وغیرہ مل جاتا تھا۔ تو خاص طور پر اس سے داغتے تھے۔ اس کو محاورے میں گل کھانا کہتے تھے۔ کسی کا شعر ہے۔

سینے کو چمن بنائیں گے ہم
گل کھائیں گے گل کھلائیں گے ہم

شاعر کہتا ہے کہ رقیب تنک حوصلہ اظہارِ عشق کرتے رہے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی ہم بھی ایسا کر بیٹھے۔ وہ ہاتھوں کے داغ دکھاتے رہے ہم دل کے۔ تاہم یہ حرکت عاشق صادق کے شایانِ شان نہ تھی اور بیکار بھی۔ اس لئے کہ اس جفاجو پہ کچھ اثر نہ ہوا۔

(۲) آپ دل سے ملے یا نہیں۔ اس کا تو مجھے علم نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مجھ سے آپ تعلقات نباہتے رہے۔ آتے جاتے رہے۔

(۳) چھاؤں بمعنی سایہ یا پرچھائیں۔ چھاؤں نہ دیکھنا۔ محاورہ بھی ہے۔ یعنی مطلق عدم واقفیت۔ شاعر کہتا ہے کہ جس کا سایہ بھی کسی نے نہیں دیکھا آج وہ راہ رو مجھے سایہ کئے لئے جا رہی ہے۔ کہتے ہیں پری کی پرچھائیں نہیں پڑتی۔ اس شعر میں اگر مؤنث کا صیغہ نہ ہوتا اور لفظ پری کی جگہ کوئی اور لفظ ہوتا تو معنی صاف طور پر رحمت اللعٰلمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ظلّ شفاعت کی طرف جاتے۔

(۴) ایسی ویسی بات۔ اینڈی بینڈی بات۔ بری بھلی بات۔ ان سب کے معنی اس بات کے ہیں جو قابلِ ناراضگی ہو سکے۔ خاطر میں نہ لانا، پرواہ نہ کرنا۔

ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا کہیں کیا جی کو رو بیٹھے
بس اب اک ساتھ ہم دونوں جہاں سے ہاتھ دھو بیٹھے

بساط اپنی میں ہم تھے آپ سو اب تو نہیں ملتے
نہ تھا کچھ اور اپنے پاس جس کو کہئے کھو بیٹھے

نہ پوچھو کچھ ہمارے ہجر کی اور وصل کی باتیں
(۱) چلے تھے ڈھونڈنے جس کو سو وہ ہی آپ ہو بیٹھے

وفا کی چھینٹ بھی تجھ پر پڑی ہرگز نہ اے ظالم
(۲) لگا تھا خون داماں سے سو وہ بھی آپ دھو بیٹھے

نہ اٹھو درد اپنے بستر سے طمع کر ہرگز
جو کچھ یوں غیب سے آوے سو تم البتہ لو بیٹھے

---

(۱) فلسفۂ انا الحق۔

(۲) چھینٹ نہ پڑنا، محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ذرا بھی اثر نہ ہونا، شائبہ تک نہ ہونا۔ اُس شخص پر شرافت کی چھینٹ بھی نہیں پڑی۔ یعنی اس شخص کو شرافت سے کوئی تعلق نہیں اُسے شرافت چھو نہیں گئی۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق پر وفا کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی کہنے کو خونِ عاشق کی چھینٹ دامن پر پڑی تھی اور وہ

خودنشان وفا تھی سو تو نے اسے بھی دھو دیا۔ اب تجھ پر وفا کی چھینٹ نہ پڑنے کا پورا اطلاق ہو گیا۔

۱

جو یاں دو چاہنے والے قریبِ یک دگر بیٹھے
ہم اپنا دل بغل میں داب لے آہ کر بیٹھے
نہ پوچھو عشق کی شورش نے عالم میں کیا کیا کیا
عجب طوفاں اُٹھائے یہ کہ جس سے گھر کے گھر بیٹھے
محبت نے تمھارے دل میں بھی اتنا تو سر کھینچا (۱)
قسم کھانے لگے تب ہاتھ میرے سر پہ دھر بیٹھے
کوئی دن اور بھی ہم کو پھرا لے گردشِ دوراں
نہیں اُٹھنے کے پھر ہرگز کہیں اب کے اگر بیٹھے
نہ آنا تھا بھرا جی میں سو اب تو کچھ کرو جانی
کہ دن جتنے تھے وعدوں کے نہ ملنے سے ہی بھر بیٹھے
پر لکھا کس لئے اتنا کوئی جانے جو کچھ جانے (۲)
سدا رہتے ہیں یوں تو لوگ یاں ایدھر اودھر بیٹھے
کوئی بیٹھ اُس کے یاں جا سکے ہے اس طرح جلدی
چلے تھے ہر گھڑی اُٹھ اُٹھ کے ہم لے در پر بیٹھے

دستور ہے کہ عزیز کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق نے تمھارے دل میں بھی اتنا تو اثر کیا کہ جب قسم کھانے لگے تو میرے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ یعنی مجھے عزیز تسلیم کیا۔ یہ شاعر کی خود فریبی ہے۔ کسی کے

سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے سے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ مرجائے معشوق جھوٹی قسم کھا رہا تھا۔ یہ فالتو نظر آئے تو قربانی کا بکرا بنا کر بھینٹ چڑھا دیا۔ ہاں دل کے بہلانے کو یہ خیال برا نہیں۔ اس نے اپنا تو سمجھا۔

لوگ ادھر اُدھر بیٹھے رہتے ہیں کے معنے تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ٹوہ میں بیٹھے رہتے ہیں۔

کبھو تو بے وفائی یاد آ جی کو ڈراتی ہے ۔۔۔ کبھو اُمید وعدوں کے بھروسے یاں دلاتی ہے

چھلاوا سا جو ہو جاتا ہے جلوہ وصل کا گہہ ہے ۔۔۔ جدائی پھر تو اک مدت عوض کیا کیا دکھاتی ہے

کبھو رونا کبھو ہنسنا کبھو حیران ہو رہنا ۔۔۔ محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

اگر رستم ہو تو بھی کب یہ صدمہ تھم سکے اس سے ۔۔۔ (۱) طپش دل کی سنبھالوں یوں سو یہ میری ہی چھاتی ہے

بھرے ہے اس طرح جو آج تو اے درد بیخود سا
بتا ہم کو بھی ٹک بارے وہ کیا آفت کہ آتی ہے

صدمہ بمعنی جھٹکا۔ دھکا۔ اردو میں متذکرہ دونوں لفظوں کے معنے رنج غم اور آفت ناگہانی کے ہوتے ہیں۔ میری ہی چھاتی ہے یعنی میری ہی ہمت ہے۔

ہر گھڑی ڈھانپنا چھپانا ہے ۔۔۔ (۱) الغرض تو بنو دکھانا ہے

وصل سے بھی تو سیری ہوتی ہے ۔۔۔ (۲) کہیں اس بات کا ٹھکانا ہے

دل لگاؤ کہ یا گلے ہی لگو ۔۔۔ داؤ ہے لگئے جو لگانا ہے

ترچھی نظروں سے دیکھنا ہر دم ۔۔۔ (۳) یہ بھی ایک بانکپن کا بانا ہے

یہ ہی اپنی بھی گوں کی باتیں ہیں ۔۔۔ آہی آجانا جدھر کو آنا ہے

واہ رے یہ زبان کی تیزی　　ہر طرح کچھ نہ کچھ سنانا ہے
دیکھیو کیجیئو نہ بیدردی
درد کو بھی تو منہ دکھانا ہے

---

(۱) لحظہ بہ لحظہ پردہ کرنے سے مدعا یہ ہے کہ بہ انداز نو بنو سامنے آیا جائے۔
(۲) انسان دُنیا کی ہر شئے سے انجام کار جھک جاتا ہے۔ حتےٰ کہ وصل بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔
(۳) بانا۔ بن ارٹ کی اصطلاح سے ہے بمعنی داؤں۔ ڈھب۔ ڈھنگ۔ رنگ۔ طریق۔

دل تجھے کیوں ہے بیکلی ایسی　　(۱) کون دیکھی ہے اچپلی ایسی
سب برا کہتے ہیں تو کہنے دو　　(۲) بات لائے ہو تم بھلی ایسی
وہ ملے گا تو ہم بھی ملتے ہیں　　(۳) آپ لگ چلئے کیا چلی ایسی
خون ہوتا ہے دل کا یاں آؤ　　مہندی پاؤں میں کیا ملی ایسی
اُس کے گھر میں کدھر سے پہنچے جا　　دل بتا دے کوئی گلی ایسی
مسکرایا خوشی سے وہ جس طرح　　باغ میں کب کھلی کلی ایسی
درد گھبرا کے تو جو یوں چونکا
کیا اُٹھی جی میں کھلبلی ایسی

---

(۱) اچپلی، چھیل چھبیلی۔ البیلی نار معشوق شوخ وشنگ۔

(۲) تم میں ایسی خوبی ہے جس سے سب جلتے ہیں اور تم کو از راہِ جسد بُرا کہتے ہیں۔ اُنھیں کہنے دو۔ نیز یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بھلا یہ بات بھی کوئی قابل ذکر ہے۔

(۳) وہ اگر ملے گا تو ہم بھی راہ ورسم بڑھائیں گے ورنہ گر پڑ کر ملنے والے ہم نہیں۔ مرتے پر مرتے ہیں۔ راہ چلتے پر نہیں مرتے۔

---

(۱) جب حدوث اپنا کھلا راز قدم کہنے لگے
کیف د کم کو دیکھ اُسے بے کیف و کم کہنے لگے

بات تم اب اپنے دل کی ہم سے کم کہنے لگے
غیر کچھ کچھ کان میں بھی دمبدم کہنے لگے

(۲) وہ ہوا بے پردہ تب ہم اس کو ہم کہنے لگے
واہ واہ قسمت کی مجبوری کو دیکھا چاہیئے

ہے کسی کا وہ دہن جس کو عدم کہنے لگے
عاقلو تم بات اپنی بھی سمجھتے ہی نہیں

(۳) بت پرستی کفر ہاں دل کی گرفتاری ہے مراد
چاہنے جس کو لگے اُس کو صنم کہنے لگے

اُس ذات کی برتری کا ادراک انسان کو اپنی کمتری سے ہوا۔ عرفت ربی بفسق العزائم جب کیسا اور کتنا دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ اس سے مبرا ہے جب اپنے تعینات پر نظر ڈالی تو اس کا لاتعین ہونا نظر آیا۔ جب اپنے تقیدات کا احساس ہوا تب اُس کے مطلق ہونے کا ادراک۔ جب انسان نے خود کو حادث جانا تب اُسے قدیم مانا۔ مراد یہ کہ انسان نے اپنی ضد سے خدا کو پہچانا۔

(۲) انا الحق کا مسئلہ ہے۔

(۳) اصل بت پرستی تو اُس دنیا کے تعلقات اور لواحقات میں پھنس

جانا ہے دُنیا میں جس سے بھی دل لگا۔ جس کا بھی انسان والہ وشیدا ہوا اس ہی کو صنم کہہ کر پکارا۔ اور صنم کے معنی بت کے ہیں۔ پس دُنیا میں دل لگانا ہی بت پرستی ہے۔ خدا پرست کے لئے لازم ہے کہ دنیا میں آلودہ نہ ہو ورنہ صحیح معنی میں خدا پرست نہیں رہ سکتا۔

---

(۱) لیکن سنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی ؛ دُشوار ہوئی ظالم تجھ کو بھی نیند آنی

(۲) ملتا نہیں جو تو ہی پھر کیا ہے زندگانی ؛ منظور زندگی سے تیرا ہی دیکھنا تھا

ساتھ اپنے سب وہ باتیں بیتی گئی جوانی ؛ محتاج اب نہیں ہم ناصح نصیحتوں کے

بہتر نہ ملئے ہم سے گر یوں ہی جی میں ٹھانی ؛ مرنے سے آگے کیا ہو مرجائیں گے تو مرجائیں

میرے غبار کا کچھ پایا نشاں نہ ہرگز
صحرا میں جا صبا نے ہر چند خاک چھانی

اے جفا پیشہ اگر تو میرا افسانۂ غم سن لیتا تو تیری بھی نیند اڑ جاتی۔
ہم تو دنیا میں دیدار خدا کے لئے آئے تھے۔ اگر یہاں اس کا جلوہ نہیں تو ہم کو اس عالم میں دلچسپی نہیں۔

---

(۱) دل پہ آفت نداں ہے پیارے ؛ جب کہا میں کہ ٹک خبر لینا

زیست اب کوئی آن ہے پیارے ؛ ایک دم میں تو جی ہی جاتا ہے

کیا ہر اس کا بیان ہے پیارے ؛ تب لگا کہنے سچ یوں ہی ہوگا

(۲) جان تو اپنی جان ہے پیارے ؛ میرے دل کی جو پوچھئے یہ ہے

جان ہے تو جہان ہے پیارے ؛ تجھ سے مرجائیں گے تو مرجائیں

(۱) ندان ۔ بمعنی انتہائی۔
(۲) گر میرے دل کی پوچھو۔ یعنی اگر میرے دل کی بات پوچھو۔

تیری گلی میں میں پھروں اور صبا چلے (۱) یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے
کس کی یہ موج حسن ہوئی جلوہ گر کہ یوں (۲) دریا میں جو حباب تھے آنکھیں چھپا چلے
ہم بھی جرس کی طرح تو اس قافلے کے ساتھ نالے جو کچھ بساط میں تھے سو سنا چلے
کہہ بیٹھیو نہ درد کہ اہلِ وفا ہوں میں
اُس بیوفا کے آگے جو ذکرِ وفا چلے

---

(۱) بندے کی کیا چلے۔ یعنی بندہ عاجز و لاچار ہے۔ بندے کی کچھ قدرت نہیں۔ اُسے کوئی دخل نہیں۔
(۲) یہ کس کی موجِ حسن جلوہ فرما ہوئی۔ جس کی پردہ داری کے خیال سے بلبلوں نے اپنی آنکھیں خود چھپالیں۔ بند کرلیں۔ انتہائی پردہ داری کا تخیل ہے۔ نیز موجوں کا تلاطم چشم ہائے حباب پر حجابات ڈالتا چلا جاتا ہے۔

جتنی بڑھتی ہے اُتنی گھٹتی ہے (۱) زندگی آپ ہی آپ کٹتی ہے
زلف کی کج ادائیاں دیکھو ہر گھڑی منہ سے جا لپٹتی ہے
آج سے آہ کی ہوا کچھ اور (۲) دیکھئے کس طرف پلٹتی ہے
جو خرابی کہ دردیاں پھیلے
(۳) دستِ قدرت سے کب سمٹتی ہے

---

(۱) جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے فی الحقیقت میعادِ حیات کم ہوتی جاتی ہے۔

(۲) "ہوا کچھ اور ہونا" محاورہ ہے۔ معنی ہیں اور ہی زور باندھ رکھا ہے۔ "کس طرف پلٹتی ہے" محاورہ ہے۔ معنی ہیں کس طرف گرتی ہے۔ کس کو برباد کرتی ہے۔ کدھر کا رُخ کرتی ہے۔

(۳) اس شعر کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دستِ قدرت سے قادرِ مطلق مراد لیں۔ اس حالت میں شعر کی شرح یوں کیجئے کہ دستِ قدرت سے جو خرابی پھیلے وہ کب سمٹ سکتی ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے جو خرابی ہو اس کو انسان درست نہیں کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ خواجہ میر درد کی رائے میں خدا کا کام دنیا میں خرابی پھیلانے کا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ وہ تو "تو در طریق ادب کوش و گو خطائے من است" کے قائل ہیں۔ نیز اس دور کے دیگر شعرا میں بھی ہم یہ بھٹکا ہوا تخیل نہیں پاتے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان دنیا کی خرابیوں کو دُور کرنے کا اہل نہیں۔ یہ طاقت و قدرت نہیں رکھتا۔

گر نام عاشقی ترے نزدیک ننگ ہے (۱) کرئیے نہ مجھ کو قتل تو پھر کیا درنگ ہے

اس خانماں خراب کو لیجاؤں میں کہاں دل پر تو یہ فضائے بیاباں بھی تنگ ہے

تیری درشتیوں کو سمجھتا ہوں آشتی تجھ کو یہ میرے ساتھ عبث عزمِ جنگ ہے

کرتا ہے اس قدر تو خفا درد کو عبث

(۲) ظالم وہ اپنی جان سے آپ ہی بہ تنگ ہے

---

(۱) اگر عاشق کا نام ہی سرے سے آپ کو بُرا لگتا ہے تو بسم اللہ اس

گناہگار کو قتل کر دیجئے۔ یہ لفظ ہی دنیا سے اٹھ جائے گا۔
(۲) ورد کو زیادہ نہ ستا وہ خود اپنی جان سے عاجز ہے۔ اکتایا ہوا ہے۔

آہستہ گذر ہو تو صبا کوئے یار سے (۱) پیچش نہ کیجیو مرے مشتِ غبار سے
اس سنگ دل کی وعدہ خلافی کو دیکھئے (۲) پتھرا گئی ہیں آنکھیں مری انتظار سے
سینے کو چاک صبح کے مانند گر کروں (۳) جوں آفتاب نکلے مرا دل کنار سے
اے درد غیر کا نہیں شکوہ مجھے تئیں
جو کچھ گلا ہے مجھ کو سو ہے اپنے یار سے

---

(۱) پیچش نہ کیجیو۔ یعنی مڑک کی نہ لیجو۔ ٹیڑھ کی نہ لیجو۔
(۲) آنکھیں پتھرا جانا۔ دیر تک انتظار میں آنکھیں کھولے رہنے کے لئے آتا ہے۔ مثلاً راہ دیکھتے دیکھتے ہماری تو آنکھیں بھی پتھرا گئیں۔ نیز سنگدل اور پتھرانا یک جا لانا حسنِ بیان۔
شاعر کہتا ہے کہ اگر دل کو درد آشنا کروں۔ عشق حقیقی میں سینہ چاک ہوں نفس کے خلاف جہاد کروں تو میرا قلب یقیناً روشن ہو جائے اور مجھے صفائے قلب نصیب ہو۔

دیکھ لوں گا میں اسے دیکھئے مرتے مرتے (۱) یا نکل جائیگا جی نالے ہی کرتے کرتے
لا گلابی دے مجھے ساقی کہ یاں مجلس ہی (۲) خالی ہو جائے ہے پیمانے کے بھرتے بھرتے
جو گیا کوچہ میں اس کے نہ پھرا ادھر کو اے صبا جاتی تو ہے جا ئیو ڈرتے ڈرتے
درد جوں نقشِ قدم تھا سر رہ پر اس کے (۳) مٹ گیا اوروں ہی کے پاؤں کے دھرتے دھرتے

(۱) نہیں معلوم دمِ آخر بھی اُسے دیکھنا مقدر ہے یا نہیں۔

(۲) فرصتِ ہستی۔ کم فرصت ہے۔ جام بھرتے بھرتے پیمانۂ حیات چھلک جاتا ہے۔ تکلفات کو جانے دے۔ جو دینا ہے سو دے دے۔ جو کرنا ہے سو کرلے۔

(۳) درد اس کوچے میں مثلِ نقشِ کفِ پا خاک افتادہ تھا۔ اور اُس کا بھی وہی حشر ہوا جو نقشِ پا کا ہوتا ہے۔ یعنی ٹھوکروں میں آکر نقش فنا ہوگیا۔

آیا ہے ابر زور چمن میں بہار ہے — ساقی شتاب آکہ ترا انتظار ہے
ظالم سمجھ کے اپنی نظر پھیکیو کہیں — گذرا جدھر یہ تیر تو پھر وار پار ہے
روتا نہیں ہے شاہدِ مینا یہ بے سبب (۱) — گردن پہ اُس کی خون کسی کا سوار ہے
ناداں نظر سے اپنی گرائے نہ درد کو
جو کچھ کہ ہے سو ہے پہ ترا دوستدار ہے

---

(۱) قلقلِ مینا کو رونے سے تعبیر کر رہا ہے۔ غالب کا ہم معنی شعر ملاحظہ ہو

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

مدت ہوئی کہ وہ سی عنایات رہ گئی (۱) — اب گاہ گاہ سیدھی ملاقات رہ گئی
یاں کون آشنا ہے ترا کس کو تجھ سے ربط (۲) — کہنے کو یہ بھی لوگوں کی اِک بات رہ گئی
بازی بدی تھی اُس نے مری چشمِ تر کیساتھ — آخر کو ہار ہار کے برسات رہ گئی
وہ دخترِ رز کہ چھلتی پھرے ہے جہان کو (۳) — کہتے ہیں درد پاس بھی اک رات رہ گئی

(۱) مدت سے وہ عنایتیں وہ التفات، وہ بے تکلفی کی ملاقاتیں تو ختم ہوگئیں سرِراہ گاہے گاہے مل لئے یا بوسہ بہ پیغام رہ گیا۔

(۲) دیدارِ خدا دُنیا میں کس کو نصیب ہوا ہے۔ یہ تجلیات کی داستانیں زیب داستاں و رونقِ بزم کے لئے ہیں۔

(۳) چھلتی پھرے ہے۔ چھل بٹے دیتی پھرے ہے۔ ٹھگتی پھرے ہے۔ دھوکہ دیتی پھرے ہے۔

گرچہ بیزار تو ہے پر اُسے کچھ پیار بھی ہے
ساتھ انکار کے پردے میں کچھ اقرار بھی ہے

زاہدا شرک خفی کی بھی خبر ٹک لینا (۱)
ساتھ ہر دانۂ تسبیح کے زنار بھی ہے

چشم رحمت سے ادھر کو بھی نظر کیجئے گا
اسی اُمید پہ آیا یہ گنہگار بھی ہے

دل بھلا ایسے کو اے دردؔ نہ دیجے کیونکر
ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے

---

(۱) زنار ڈورہ ہے۔ اور مشرکین کی مذہبی نشانی۔ خواجہ میر دردؔ کہتے ہیں کہ دلوں میں جو شرک پوشیدہ ہے۔ اس کی طرف بھی نگاہ رہے۔ تسبیح کو دیکھ لو وحدت پرستوں کی عبادت سے متعلق ہے لیکن اپنے میں زنار لئے ہوئے ہے۔ مراد اس کی ڈورے سے ہے جس میں تسبیح کے دانے پرئے جاتے ہیں۔ شرک خفی وہ شرک جو پوشیدہ ہو۔

جب نظر سے بہار گذرے ہے
جی پہ رفتار یار گذرے ہے

وہ زمانے سے باہر اور مجھے (۱)
رات دن انتظار گذرے ہے

جس کے تو ہو کے سامنے گذرے (۲) آپ سے بار بار گذرے ہے
نالۂ زار درد کا ہر ایک
چھوٹتے دل کے پار گذرے ہے

---

(۱) وہ زمان و مکان سے بالاتر اور ہیں عالم زمان و مکان میں اس کا متلاشی و منتظر۔ رات دن انتظار کا پہلو بتا رہا ہے۔ کہ شاعر کی مراد اس دنیا سے ہے، جو شب و روز پر مشتمل ہے۔ مراد یہ کہ اس دنیا میں خدا کی تلاش بار آور نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یہ محدود ہے اور وہ لامحدود۔

(۲) آپ سے گذرنا۔ بمعنی از خود رفتہ ہونا۔ وارفتہ و بے خود ہونا۔

تو جو نکتا عبث ہے کسی بات کے لئے — میں آگیا ہوں صرف ملاقات کے لئے
یوں ہی تمام جھگڑے ہی رگڑے میں ہو گئی — ہر دن خراب پھرتے تھے جس رات کیلئے
اگلے معانقے کو اگر کیجئے معاف — لگ جاؤں اب گلے سے مکافات کیلئے

ہم جانتے ہیں دار اندھیرے میں رات کو
(۱) تو لگ رہا ہے کوچہ میں جس گھات کے لئے

---

(۱) اس شعر کے مجازی معنی تو صاف ہیں۔ لیکن ایک حقیقت اور معرفت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ شاعر اندھیرے اور کوچے سے دنیا مراد لے رہا ہے۔ کہتا ہے کہ تو اس تیرہ و تار دنیا میں تلاش خدا کے لئے آیا ہے۔

غمناکی بیہودہ رونے کو ڈبوتی ہے — گر اشک بجا ٹپکے آنسو نہیں موتی ہے

دم لینے کی فرصت یاں ٹک دی نہ زمانے نے — ہم تجھ کو دکھا دیتے کچھ آہ بھی ہوتی ہے
خورشید قیامت کا سر پر تو اب آپہونچا (۱) — غفلت کو جگا دینا کس نیند یہ سوتی ہے
خورشید نہ تنہا ہے گردش ہیں زمانے کی (۲) — یاں اپنے دنوں کے تئیں شبنم بھی تو روتی ہے

---

(۱) غفلت سے کہہ دو وہ وقت آگیا جب کہ موت کی نیند سوئے بھی جاگ اُٹھیں گے۔ اب تو بھی بیدار ہو جا۔ الفاظ تو یہی معنی دیتے ہیں جو پیش کر دئے گئے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ غفلت جاگے گی تو غفلت شعاریاں شروع ہو جائیں گی اس کا تو سونا اچھا۔ شاید شاعر کا مدعا خوابِ غفلت سے جگانا ہے۔ یا غفلت سے اہلِ غفلت مراد ہے۔

(۲) "اپنے دنوں کو رونا" محاورہ ہے۔ یعنی اپنی حالت پر رونا۔ شاعر کہتا ہے کہ دُنیا کی ہر چیز مصائب میں گرفتار ہے گریہ کناں ہے۔ مصروفِ آہ و نالہ ہے خورشید اپنی جگہ چکر میں ہے۔ شبنم الگ آنسو بہا رہی ہے۔ کسی کو آرام نصیب نہیں۔ ہر ایک آلام نصیب ہے۔ نیز خورشید و شبنم کا تعلق آشکار ہے۔

کہاں میں کہاں تو کہاں نوجوانی — جو ملنا ہے مل پھر کہاں زندگانی (۱)
عجب خواب درپیش ہے پھر تو سب کو — سناؤ ٹک اب اپنی اپنی کہانی
دلاسا تو دیجو تو ٹک جاکے اُس کو — تڑپتی ہے بیکس مری جاں فشانی
نہ جالے گا جبتک مرے جی میں جی ہے — ترا غم ہی پیارے مرا یار جانی

---

(۱) سب پر ایک روز خوابِ عدم طاری ہوتا ہے۔ یہ فرصت

غنیمت ہے۔ اپنی اپنی کہہ سُن لو۔

درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے (۱) جو سانس بھی نہ لے سکے سو آہ کیا کرے
فرسودگی ہے رشتۂ تسبیح کا حصول (۲) دل میں کسو کے آہ کوئی راہ کیا کرے
جس دل پہ بیوفائی معشوق کے سبب یہ کچھ گذر چکا ہو وہ پھر چاہ کیا کرے
دل دے چکا ہوں اس بتِ کافر کے ہاتھ میں اب میرے حق میں دیکھئے اللہ کیا کرے

---

(۱) اظہار حال کے لئے کم از کم آہ ضروری ہے۔ یہاں بیمار غم کو سانس لینا مشکل ہے۔ آہ در کنار۔ پھر حالِ دلِ رنجور بیان ہو تو کیونکر۔

(۲) تسبیح کا ڈورہ دانوں میں سے گذرتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو دانوں کے دل میں راہ ہے۔ دل میں راہ کرنا مراد ہے۔ دل میں جگہ کرنا۔ شاعر کہتا ہے تسبیح کے ڈورے نے دانوں کے دلوں میں جگہ پیدا کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود گھس گھسا کر فرسودہ ہو کر رہ گیا۔ اس کو دیکھنے کے بعد کوئی کس ہمت پر دلوں میں جگہ پیدا کرے۔

آنکھوں کی راہ ہر دم اب خونِ دل رواں ہے جو کچھ ہے میرے دل میں منہ پر مرے عیاں ہے
غنچہ ہے دل گرفتہ۔ گل کا ہے چاک سینہ (۱) گلشن میں ہے تو یہ کچھ آسودگی کہاں ہے
آہوں کی کشمکش میں کہیں دیکھیو نہ ٹوٹے (۲) تارِ نفس سے اے دل وابستہ میری جاں ہے
گم نام اب جہاں میں مجھ سا نہیں ہے کوئی
عنقا کا نام تو ہے ہر چند بے نشاں ہے

---

(۱) غنچۂ دل شگفتہ نہیں مغموم ہیں۔ گل چاک گریباں سینہ دریدہ نظر آئے گا۔ جب گلشن جیسے مقام بہار میں یہ حال ہے۔ پھر آسودگی کہاں ہے جہانِ خراب میں۔

(۲) تارِ نفس اور جان متعلق و مترادف ہیں۔ نیز تار کا کشاکش میں ٹوٹ جانا معمولی سی بات۔ شاعر دل میں کہہ رہا ہے کہ تو آہیں کرتا رہتا ہے لیکن اس کا خیال رہے کہ نزاع میں تار نفس نہ ٹوٹ جائے۔ اور رشتۂ حیات ہی منقطع ہو جائے۔

(۳) عنقا کا وجود نہیں۔ نام تو ہے۔ میں وہ بے نشان ہوں کہ نام تک سے محروم ہوں۔

دل تڑپتا ہے درد پہلو ہے (۱) مرگ آہو نچیو کہ قابو ہے
غم سے پہچانتا نہیں ہوں میں (۲) کہ مرا سر ہے یا کہ زانو ہے
منع صہبا نہ کر مجھے اے شیخ (۳) مے پرستوں کے حق میں دارو ہے
جلوہ گر ہے تجھی میں اے ذرّے (۴) جس کی خاطر تجھے تگاپو ہے

ہستی ہے سفر عدم وطن ہے (۱) دل خلوت و چشم انجمن ہے
ہر چند کہ سنگ دل ہے شیریں لیکن فرہاد کوہ کن ہے
دیکھا تو یہ شورش من و ما (۲) ہنگامۂ وصل جان و تن ہے
مت جا تر و تازگی پہ اس کی عالم تو خیال کا چمن ہے

---

(۱) اس شعر میں دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ دل تڑپ رہا ہے۔ کرب میں مبتلا

ہے۔ درد کی شدت ہے اے موت ایسے میں آجا۔ تیرا قابو آسانی سے چل جائے گا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس درد و کرب کے باوجود ابھی تک مجھے اپنے پر قابو ہے۔ از خود رفتہ نہیں ہوں رازِ عشق و دردِ محبت کی داستان سفینۂ دل میں ہے۔ زبان تک نہیں آئی ہے۔ اے موت تو آجا ورنہ" دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا۔

(۲) سر بزانو ہوا علامت غم و رنج ہے۔ خواجہ میر درد کہتے ہیں کہ میں غمزدہ اتنے عرصے تک سر بزانو رہا ہوں کہ اب دونوں میں امتیاز ناممکن ہو گیا۔

(۳) دارو کے لفظ میں حسن بیان ہے۔ ہندی میں یہ لفظ شراب اور دوا دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ نیز اگر شراب بحالتِ مجبوری طبیب باشرع کے حکم سے بطور دوا استعمال کی جائے تو جائز ہے۔

(۴) خدا انسان میں موجود ہے اور یہ حقیقت ناآشنا کور چشم اُسے دنیا میں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

---

(۱) پہلا مصرعہ تو صاف ہے۔ دوسرا بیشک تشریح طلب۔ شاعر کہتا ہے کہ دل تو ایک ہی کا پرستار ہے آنکھیں بیشک جلوہ ہائے گوناگوں میں مصروف ہیں۔ شاعر آنکھ کہہ کر جو اس خمسے سے مراد لے رہا ہے۔

(۲) یہ نفسا نفسی اس ہی عالمِ ہستی تک ہے۔

---

(۱) ہوا کیا درد کو پیارے گلی کیوں آج ہے سونی — نہ وہ نالوں کی شورش ہے نہ آہوں کی وہ ہے دھونی
(۲) محبت کے شراروں نے چھائی "جس طرح بھونی — جلا کر دیکھ نامے کو حقیقت گر نہیں پڑھنا

طپش کو دل کی میں سمجھا تھا یہ آنسو بجھا دینگے ۔۔۔ وُلے یہ آگ تو پانی سے بھڑکی اور بھی دونی

پڑی ہے خاک پر یہ لاش اُس رشکِ شہیداں کی
لہو کے آنسوؤں روتا ہے جس کو قتل کر خونی (۳)

---

(۱) سونی یعنی خموش بغیر چہل پہل۔
(۲) اگر تو خط کو نہیں پڑھتا تو اس کو جلا کر حقیقت کا تماشہ دیکھ کہ عشق نے سینے کو کس طرح داغ داغ کیا ہے۔ اس شعر میں دو نکتے ہیں ایک تو بعض سیاہیاں آگ دکھانے پر اُبھرتی ہیں۔ پوشیدہ خطوط اُن سے لکھے جاتے ہیں اور سرنامہ پر بطور اشارہ یہ شعر کام دے سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کاغذ کو جب جلاؤ تو جگہ جگہ سے آگ پکڑتا اور گل خوردہ سا ہو جاتا ہے۔
(۳) رشکِ شہیداں کا اشارہ شہید اکبر کی جانب معلوم ہوتا ہے۔

کیا دل سے بھی زیادہ آئینہ میں صفا ہے (۱) تو اس قدر جو اُس کا مشتاق ہو رہا ہو
دل مت کہیں لگانا الفت بُری بلا ہے (۲) کوئی بھی شخص اُس کا مارا ہوا نہ پنپا
گر جی کو مار سکئے اے دل یاد کیمیا ہے (۳) سیماب کشتہ کس کا ماء الحیات کیدھر

---

(۱) معشوق کو آئینے سے خاص شوق ہوتا ہے۔ میر درد کہتے ہیں کہ اگر تو اس کی صفا کا دلدادہ ہے تو دل اس سے زیادہ صفا کا حامل ہے۔ اس کی طرف رجوع کر۔
(۲) نہ پنپنا معنی ہیں۔ سانوٹا نہ ہوا۔ تندرست نہ ہوا۔ طاقت نہ پکڑی پھر قوت نہ آئی۔ جیتا نہیں۔ بحال نہ ہوا۔

(۳) خواجہ میر درد ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

اکسیر پر مہوس اتنا نہ ناز کرنا
بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا

---

(۱) کھوئے جس طرف نظر سمجھئے آہ کیجئے
کس کے تئیں نہ دیکھئے کس پہ نگاہ کیجئے
اس کی طرف ہو سو ہو آپ نباہ کیجئے
عہد شکن ہو خواہ وہ دل شکنی کیا کرے
(۲) دل میں کسو کے درد یاں ہووے تو راہ کیجئے
کعبے کو بھی نہ جایئے دیر کو بھی نہ کیجئے منہ

دنیا کی ہر چیز چشم بینا کے لئے منظر فنا و تاسف پیش کرتی ہے۔
دل بدست آور کہ حجِ اکبر است۔

نے وہ بہار وائے نہ یاں ہم جواں رہے
ملئے پھر اس سے آہ پہ وہ دن کہاں رہے
آباد رکھیو خانۂ دنیا کو اے سپہر
یک چند ہم بھی آن کے یاں میہماں رہے
دل اپنے پاس گو کچھو رہتا نہیں ہے درد
پر ہے یہی دعا وہ رہے خوش جہاں رہے

اگر آہ بھریئے اثر شرط ہے
(۱) وگر ضبط کریئے جگر شرط ہے
بڑا غبن فاحش ہے انسان میں
(۲) پرکھنے کو اس کے نظر شرط ہے
قدم عشق میں درد رکھتا ہے تو
وہ جانے کہاں ہیں خبر شرط ہے

---

(۱) آہ کیجئے تو با اثر کیجئے۔ لیکن ضبط کرنے کے لئے دل و جگر درکار ہے ع
وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

(۲) انسان حامل ہے بہت سخت دھوکے کا اہلِ نظر ہی اس کو پرکھ سکتے ہیں "غبن فاحش" تجارتی اصطلاح ہے۔ وہ خسارہ جو دو ماہرینِ تجارت معاملے میں بتائیں

لختِ جگر سب آنسوؤں کے ساتھ بہ گئے (۱) کچھ پارہ ہائے دل ہیں کہ پلکوں میں رہ گئے
کس طرح سے اُسی نے بھی سن سنکے ٹالیاں ہر چند ہم بھی باتوں میں کچھ کچھ تو کہہ گئے
اُسکی نظر میں درد یہ کچھ بات ہی نہیں دانسنت میں ہم اپنی جو کچھ سن کے رہ گئے

---

(۱) جگر کے ٹکڑے تو آنسوؤں کے ساتھ بہ گئے۔ لیکن پارہ ہائے دل پلکوں میں اٹک کر رہ گئے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیوں مژگاں میں اٹک کر رہ گئے۔ جواب یہ ہے کہ امید وار دید ہیں۔

یہ زاہد کب خطا سے بے خطر ہے (۱) اگر آدم نہیں تو بھی بشر ہے
علاج دردِ سر صندل ہے لیکن ہمیں گھسنا ہی اُس کا دردِ سر ہے
سراپا چشم ہوں جوں آئینے پر
کسو پر درد میری کب نظر ہے

---

(۱) اگر زاہد کہے کہ میں آدم نہیں جو خطا کروں۔ پھر بھی بشر ہے۔ یعنی صاحبِ شر ہے۔ آدم مراد حضرت آدمؑ ہے۔

(۲) چشمِ آئینہ دیکھتی ہر چیز کو ہے۔ لیکن اثر کسی کا نہیں لیتی۔ کسی چیز پر نظر ہونے کے معنی ہیں کسی چیز کا خواہش مند ہونا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں آئینے کی مانند دنیا کی

ہر شے کو نظر میں رکھتا ہوں۔ لیکن کسی چیز پر نظر نہیں رکھتا۔ دیکھتا سب کچھ ہوں۔ تمنا کسی کی نہیں رکھتا۔ اثر کسی کا نہیں لیتا۔

نہ دیکھی زمانے کی تو چشم پوشی (۱) کروں کس کے ساتھ اے شرر گرمجوشی
کرے ہے تبسم ترا گل فروشی خبر اپنی لے اے گلستانِ خوبی
کسو کی تو آنکھوں نے کی بادہ نوشی نپٹ مست ہی بوئے نرگس چمن میں

---

(۱) چشم پوشی، نظریں بچانے کے معنی میں ہے۔ اور نظریں بچانا بیوفائی کے مترادف۔ شرر، گرمجوشی اور چشم کا یک جا ہونا حسن بیان ہے۔
نپٹ بمعنی بہت

کہ اُس نے آپ تماشے کو مہربانی کی (۱) جگر پہ داغ نے میرے یہ گلفشانی کی
اگرچہ اس نے بھی اک عمر تیشہ رانی کی مری سی نالہ تراشی نہ کرسکا فرہاد
عجب ہے خضر نے کیونکر کے زندگانی کی ہم اتنی عمر میں دنیا سے ہو گئے بیزار

---

(۱) داغوں کے کرم سے میرا دل ایسا گلستاں بن گیا کہ وہ خود اس کی سیر کو آئے۔

پھوڑا یہ درد دیکھئے کیدھر کو منہ کرے (۱) دل سمت سینہ یا طرف سر کو منہ کرے

کیا کم ہے مُرغ قبلہ نما سے یہ مرغِ دل (۱) سجدہ اُدھر ہی کیجئے جیدھر کو منہ کرے
اس کے تئیں بھی دخترِ رز ٹک تو منہ کرے (۲) میں جانوں پھر یہ زاہد اگر گھر کو منہ کرے

---

(۱) جب پھوڑا ایک جاتا ہے تو مواد زور مار کر کسی نہ کسی طرف سے کھال کو شق کر دیتا ہے۔ اس کو پھوڑے کا منہ کرنا کہتے ہیں۔ نیز منہ کرنا۔ کسی بلا، آفت یا طوفان کے کسی طرف جانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ دل جو پکا پھوڑا ہو گیا ہے۔ خدا معلوم کس طرف کا رُخ کرے۔

(۲) اس کے تئیں یعنی اس کی طرف، اس کی جانب۔ شاعر کہتا ہے۔ کہ یہ دخترِ رز ایسا فریفتہ۔ از خود رفتہ اور اپنا دلدادہ کر لینے والی ہے کہ اگر زاہد کی جانب ذرا بھی التفات کرے۔ ذرا اس سے رخ دے کر بات کر لے تو پھر ہم ذمہ لیتے ہیں جو یہ گھر کا نام بھی لے۔ بس اس ہی کا غلام ہو جائے۔ کنونڈا ہو جائے اس ہی کے در پر عمر گذار دے۔ حضرت زاہد جو اب تک بچے بچے پھرتے ہیں اس کی وجہ ان حضرت کی پاکبازی نہیں بلکہ اس کی بے توجہی ہے وہ ان جلیبوں کو منہ ہی نہیں لگاتی۔

مت اُنکھیو تو اس میں کہ مشہود کون ہے (۱) ہر مرتبے میں دیکھیو موجود کون ہے
دونوں جگہ ہیں یعنی معلے ہے جلوہ گر (۲) غافل ایاز کون ہے محمود کون ہے
تجھ پر کھلا ہے راز الیہ المصیر گر (۳) ہر فعل تو سمجھیو کہ مقصود کون ہے

---

(۱) تو واجب الوجود کی طرف دیکھ۔ دنیا اور دنیا والوں کی طرف خیال نہ کر
(۲) لیلیٰ شد است مجنوں، مجنوں خبر نہ دارد۔ من تو شدم تو من شدی۔ عاشق و معشوق میں افتراق نہیں۔ ایاز و محمود اصل میں ایک ہی ہیں۔ عشق کی شانیں ہیں۔ جو دو شکلوں میں نظر آ رہی ہیں۔ شاعر نے یہ دعوے ثابت کرنے کے لئے لفظ مولے سے کام لیا ہے۔ جس کے معنے غلام اور آقا دونوں کے ہیں۔
(۳) تجھ پر جب یہ امر روشن ہے کہ ہر شے کو واپس جانا ہے تو اشیاء کو نہ دیکھ ملجا و ماویٰ پر نظر رکھ

کس زلف کی تو مجھ میں نسیم سحری ہے ۔۔۔ یک خلق سیہ مست مئے بے خبری ہے
(۱) کیا آگ الٰہی میرے سینے میں بھری ہے ۔۔۔ ہر آہ شرر بار ہے جوں سرو چراغاں
(۲) شیشہ جو بغل میں ہے اسی میں تو پری ہے ۔۔۔ غافل تو کدھر بہکے ہے ٹک دل کی خبر لے

---

(۱) یہ کس قیامت کی آگ میرے سینے میں بھری ہے کہ جو آہ نکلتی ہے مثل سرو چراغاں شرر بار نکلتی ہے۔ جس جگہ آگ بھری ہو وہاں سے جب ہوا ہو کر گذرے گی تو اپنے ساتھ شعلہ اور چنگاریاں لئے ہوئے ہو گی۔
(۲) جلوۂ خدا دل نشیں ہے اور تو اس کی تلاش میں دربدر سرگرداں۔

رباعیات

جان تو اک جہان رکھتا ہے ۔۔۔ کون میری سی جان رکھتا ہے
تیرے یہ ڈھنگ اور تجھ سی میاں ۔۔۔ درد کیا کیا گمان رکھتا ہے

دنیا میں ذی روح تو سب ہیں۔ لیکن جیسی جان میری ہے ویسی جان کسی کی نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ سب کی جان تو معمولی جان ہے لیکن میری جان معشوق ہے تیرے تو ایسے طور طریقے اور دل کی سادہ لوحی دیکھو کہ تجھ سے کیا کیا امیدیں باندھے بیٹھا ہے۔

نہیں چھوڑتی قید ہستی مجھے | مگر کھینچ لے جائے مستی مجھے
زمانے نے اے درد جوں گردباد | دکھائی بلندی و پستی مجھے

کیا جانیے کیا دل پہ مصیبت یہ پڑی ہے | اک آگ سی کچھ ہے کہ وہ سینے میں گڑی ہے
اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے | معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

بس ہے یہی مزار پہ میرے کہ گاہ گاہ | جائے چراغ کوئی دل مہرباں جلے
اے درد کیا عجب ہے مرے اشک و آہ سے | ڈوبے اگر زمین وگر آسماں جلے

میں اپنی قبر پہ پھولوں کی فراوانی چاہتا ہوں نہ گل افشانی۔ بس اتنی تمنا ہے کہ مجھ سوختہ ساماں کی لحد پر بجائے چراغ کوئی دل مہرباں سوزاں ہو۔ دنیا میں ہمدرد چاہتا ہوں۔

دوسرے شعر میں اشک و آہ سے ڈوبنا اور جلنا (صنعتِ لف و نشر مرتب ہے)

آیا نہ چین جی کو نہ دل سے تپک گئی | میں چپ رہوں کہاں تئیں چھاتی تو پک گئی

اب کون حالِ دل کہے اس مستِ ناز سے　　اک آہ تھی سو وہ بھی سرا پنا پٹک گئی

تپک ۔جلن ۔سوزش ۔لپکن ۔زخم کی تکلیف ۔

دل ہی کو گر قرار نہ ہووے تو کیا کرے　　اپنا جب اختیار نہ ہووے تو کیا کرے
عاشق تو جانتا ہی نہیں اور کون ہے　　اس کو پر اعتبار نہ ہووے تو کیا کرے

دل کے لئے سوائے بے قراری کے کوئی چارہ کار ہی نہیں ۔ نیز اپنا دل پر اختیار ہی نہیں ۔
عاشق تو سوائے تیرے کسی اور کے وجود تک کو نہیں جانتا ۔ اگر تجھے اب بھی اعتبار نہیں تو مجبوری دنا چاری ۔

نہ ملئے یار سے دل کو تو کب آرام ہوتا ہے　　اگر ملئے تو مشکل ہے کہ وہ بدنام ہوتا ہے
یہ حسن و عشق مل سمجھے ہیں آپس ہی میں جو ہوگا　　پر ان دونوں کے الجھیڑے میں اپنا کام ہوتا ہے

اپنا کام ہوتا ہے ۔ یعنی اپنا کام تمام ہوتا ہے ۔

یہی پیغام درد کا کہنا　　گر کوئی کوئے یار میں گذرے
کون سی رات آن ملئے گا　　دن بہت انتظار میں گذرے

ہمارے جامۂ تن میں نہیں کچھ اور بس باقی — گریباں میں ہے مثلِ صبح اِک تارِ نفس باقی
یکایک عشق کی آتش کا شعلہ اسقدر بھڑکا — نہ چھوڑا اسنے زمینِ دل میں کچھ بھی خار و خس باقی

پیرہن تن و لباس جسم میں اب سوائے تارِ نفس کے اب اور کچھ نہیں۔ شعلۂ عشق و آتشِ الفت نے ایسا زور باندھا کہ تمام خار و خس پھونک دیئے۔ اب صرف تارِ نفس رہ گیا ہے۔ بہ اعتبار دل خواہشات خار و خس ہیں۔ خدا اور انسان کے درمیان حجاب۔ نیز باعث تکدر۔

گلرخوں کا بحر و بر میں جو کہ ہی مدہوش ہے — ہمنے دریا میں بھی دیکھا بلبلوں کا جوش ہے
وصفِ خاموشی کے کچھ کہنے میں آسکتی نہیں — جس نے اس لذت کو پایا ہی سدا خاموش ہے

دنیا میں ہر جگہ گلرخوں کی محبت کا چرچا ہے۔ کیا خشکی۔ کیا تری۔ زمین پر بلبل گل کے گرویدہ ہیں تو سینۂ آب بھی بلبلوں سے خالی نہیں۔ سارے شعر کا مدار بلبلوں پر ہے۔

گر جان ہے تو جان کے آزار ساتھ ہیں — یاں زندگی کی مردن دشوار ساتھ ہے
دنیا وہ فاحشہ ہے کسو سے نہیں بچی — دیکھا جسے تو اس کے یہ مردار ساتھ ہے

زندگی خود اپنے آلام کے باعث موت ہے اور سخت موت ہے۔

دوسرے شعر میں شاعر دنیا کو ایک آوارہ عورت سے تشبیہ دیتا اور ثبوت میں کہتا ہے۔ کہ دیکھ لو دُنیا میں جو بھی آیا اُس کے ساتھ تعلق دُنیا موجود ہے دنیا کسی سے نہیں بچی محاورہ ہے مثلاً فلاں عورت کسی سے نہیں بچی۔ معنے ہیں کہ اس کا سب سے تعلق ہے۔

پوچھ مت قافلۂ عشق کدھر جاتا ہے | راہ رو آپ سے اس رہ میں گذر جاتا ہے
گو اُچٹتا ہے مرا نالہ بتوں کے دل سے | کچھ نہ کچھ کام تو اپنا بھی یہ کر جاتا ہے

دوسرے شعر میں لفظ اُچٹنا تشریح طلب ہے۔ چیز پتھر سے ٹکرا کر اُچٹتی ہے۔ شاعر کہتا ہے بتوں کا دل پتھر کا ہے جب میرا نالہ اُن سے ٹکراتا ہے تو اُچٹ جاتا ہے۔ تاہم کچھ نہ کچھ اثر چھوڑ جاتا ہے۔ چیز پڑ کر اُچٹ جائے لیکن نشان رہ جاتا ہے۔

گر معرفت کا چشم بصیرت میں نور ہے | تو جس طرف کو دیکھئے اس کا ظہور ہے
آتی ہے دل میں اور ہی صورت نظر مجھے | شاید یہ آئینہ بھی کسی کے حضور ہے

آنکھ معرفت الٰہی سے بہرہ مند ہے تو ہر شے میں حسنِ ازل دیکھ لے گی۔ میں اپنے آئینۂ دل میں کسی اور ہی کا عکسِ رُخ دیکھ رہا ہوں یقیناً یہ آئینہ اس ہی کے روبرو ہے۔ آئینہ جس کے سامنے ہوگا اس ہی کا منہ دکھائے گا۔

نہ کچھ غیر سے کام نے یار سے | کہیں چھوٹوں اس دل کے آزار سے

مجھے دے کے دشنام کہنے لگا ۔۔۔ نہ ہوگا خوش اب بھی تو بیزار ہے

بیزار، بمعنی جوتی۔ بیزار ہے۔ یعنی جوتی ہے۔ ہماری بلا سے۔ ہم کو پروا نہیں۔

غیر اس کوچہ میں اب دیکھا تو کم آنے لگے ۔۔۔ تیری خاطر میں کبھو شاید کہ ہم آنے لگے
کون ایسا آ رہا ادھر کہ تم اس کی طرف ۔۔۔ آ نہ پھرتے تھے کبھو یا دم بدم آنے لگے

پہلے شعر میں خاطر کے معنی خیال یا دل کے ہیں۔

افراد

سلجھتی بات جس طرح ہوں ہیں ہم ویسا ہی سلجھاتے ۔۔۔ یہ الجھیڑا نظر آتا تو اپنا دل نہ الجھاتے

گل کھائے تھے جنھوں نے وہ گل کچھ نہ کچھ کھلے ۔۔۔ ہر داغ اپنے دل کے تو سب خاک میں ملے

گل خوردہ ہونا۔ عاشق کی علامت ہے "گل کھلنا" برا نتیجہ نکلنا۔ مثلاً آپ کی بدکلامیوں نے اچھے گل کھلائے۔ شاعر کہتا ہے کہ دوسروں کے عشق کا برا یا بھلا کچھ نتیجہ تو نکلا۔ لیکن ہمارے داغہائے دل خاک میں مل گئے بے نتیجہ رہ گئے۔

اگر نہاں ہے تو تو ہے وگر عیاں تو ہے ۔۔۔ غرضکہ دیکھ لیا میں جہاں تہاں تو ہے

دل کو سب قیدوں سے اس وقت میں آزادی ہے　　مر چکے اب ہمیں غم ہے نہ کچھ شادی ہے

یارب سپہر اتنی تو اب درگذر کرے　　کوئی خانماں خراب کسی دل میں گھر کرے

شاعر کہتا ہے کہ چرخ ستم گار ہم خانہ بربادوں سے اتنی تو مراعات برتے کہ اگر روئے زمین پر جگہ نہیں تو کسی دل میں ہی گھر بنا لینے دے۔

اس تیغِ آبدار کا گر یہ ہی وار ہے　　پیاسے تو زخمیوں کا ترے بیڑا پار ہے

میرا تو جی وہیں رہتا ہے نت جہاں تو ہے　　اگرچہ میں یہ نہیں جانتا کہاں تو ہے

نہ مرتے ہیں نہ نیند آتی نہ وہ صورت بسرتی ہے　　یہ جیسے جاگتے ہم پر قیامت شب گذرتی ہے

نہ موت آتی ہے اور نہ نیند۔ نہ دل سے تیری یاد جاتی ہے۔ بسرنا۔ یعنی بھولنا مثلاً وہ تو بھولے بسرے بھی ادھر نہیں آتے۔ زندگی میں ہم پر ہر رات قیامت گذر جاتی ہے۔ حالانکہ یہ تو بعد مرگ ہونی چاہیئے۔

نہ یاں قصہ سکندر کا نہ مذکور سلیمانی　　ہمارے بزم میں ہوتا ہے اور ہی ذکر سلطانی

شاید سلطان المشائخ یا سلطان دو جہاں کی طرف اشارہ ہے۔

از بسکہ جہاں نقشِ فنا کا ہی نگیں ہے	دل جس سے لگا پھر اُسے دیکھا تو نہیں ہے

دنیا فنا در آغوش ہے۔

طلسم ہستی موہوم فنل پر سخت چنبر ہے	بہ رنگِ عکس مجھ کو آئینہ سد سکندر ہے

شاعر کہتا ہے کہ یہ حیات فانی میرے واسطے چنبر ہے۔ مجھے دام بلا اور اس حلقۂ خاکی سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ جس طرح عکس کے لئے آئینہ سد سکندر ہوتا ہے۔ یعنی عکس آئینے کے پار نہیں جا سکتا۔ حالانکہ آئینہ نہایت نازک چیز ہے اور اس کے پار چلا جانا کوئی بات نہیں۔ لیکن عکس کی قدرت سے باہر ہے۔ اس ہی طرح گو اس ہستی کی کچھ ہستی نہیں۔ لیکن میرے لئے اس سے مفر ممکن نہیں۔

تعین گر مٹے دل سے تو کفر آثار ہو جائے	اگر عقدے کھلیں تسبیح کے زنار ہو جائے

اگر دل سے تعنیات اُٹھ جائیں۔ یعنی وہ معبود ہے اور ہم عبد۔ وہ باقی ہے اور ہم فانی۔ وہ قادر ہے اور ہم مجبور۔ وہ لامحدود ہے اور ہم محدود۔ یہ بُرا

ہے یہ بھلا۔ یہ نیکی ہے یہ بدی۔ یہ حرام ہے اور یہ حلال وغیرہ۔ اگر یہ حدود نہ رہیں تو کفر کے نشان ظاہر ہونے لگیں۔ اسلام نام ہی ان حدود کا ہے۔ مذہب کی بنیاد ہی ان عقائد پر ہے۔ کفر اور ایمان میں بس اتنا ہی بل ہے۔ ایک ان حدود و تعینات کا قائل ہے۔ دوسرا منحرف مرتکب سرگردانی۔ شاعر اس دعوے کو مثال دے کر سمجھاتا ہے کہ تسبیح کی گرہیں کھول دو۔ گراہوں سے مراد تسبیح کے دانے ہیں جو گول ہوتے ہیں اور گرہ کے ہم شکل۔ جب یہ گرہیں نہ رہیں گی۔ یعنی تسبیح میں دانے نہ رہیں گے تو صرف ڈورہ رہ جائے گا اور وہ زنار کے مترادف اور نشان کفر۔

اگر دیکھے یہ قامت سروِ گلشن پست ہو جاوے ‏ ‏ ‏ ‏ تری آنکھیں دکھا دیجے تو نرگس مست ہو جاوے

سنگدل کیا تجھ کو کہئے اپنی ہی تقصیر ہے ‏ ‏ ‏ ‏ نالہ ہے سو بے اثر اور آہ بے تاثیر ہے

نے دن ہی نبڑتا ہے نہ یاں رات کٹے ہے ‏ ‏ ‏ ‏ تجھ بن کہو کیا تجھ سے میں کس طرح کٹے ہے

چھوٹیے اس دکھ سے جو مر جایئے ‏ ‏ ‏ ‏ کیجئے کیا آہ کدھر جایئے

سانس ہے یا کہ پھانس کھٹکے ہے ‏ ‏ ‏ ‏ اس طرح جی میں سانس کھٹکے ہے

---

(۱) یہ نرگس ہے سو مرفوع القلم ہے۔ ‏ ‏ ‏ ‏ مشابہ کوئی ان آنکھوں سے کم ہے

تیری آنکھوں سے کسی کو بھی مشابہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نرگس ہے سو قابل نظر اندازی۔ مرفوع القلم، جو چیز تحریر میں نظر انداز کر دی جائے۔ جس پر سے قلم اٹھا لی جائے

عبث دل بیکسی اپنی پہ تو ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دوانے عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے

بت پرستی ہے اب نہ بت شکنی
کہ ہمیں تو خدا سے آن بنی

اب ہم کو محض خدا سے واسطہ ہے بتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ بت شکنی کا نہ بت پرستی کا

نہیں ہے بے سبب یہ خندۂ دنداں نما ہر دم
کسو کی تو لہو پینے پہ یعنی دانت رکھتا ہے

دانت رکھنا۔ کسی چیز پر نیت رکھنا۔ مثلاً فلاں شخص دوسروں کے روپے پر دانت رکھتا ہے۔

زبس دردِ جدائی نے ترے بندوں کو مارا ہے
اگر آزار بھی ہوتا ہے تو وجع مفاصل ہے

وجع مفاصل ایک مرض کا نام ہے جوڑوں میں درد ہوتا ہے۔

دیکھ کر رخسار تیرے کی صفا
آئینہ کی یاں اکھڑتی ہے قلعی

رباعیات متفرق

آرام نہ دن کو بے قراری کے سبب
نے رات کو چین آہ و زاری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو
یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

کیا فائدہ گر باز ہے یاں دیدۂ سر
نت پردۂ چشم دل ہے کورئی دگر
جوں آئینہ ہر چند کھلی آنکھ و لے
آتا ہے نظر میں عیب اپنا جوہر

مانا کہ ہماری ظاہری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ لیکن چشم حقیقت ہیں بند۔ ہماری مثال آئینے کی سی ہے کہ گو دیدہ وا ہیں و لے دید در نہیں۔ اپنے عیب و ہنر کی خبر نہیں حتےٰ کہ عیب کو بھی جوہر سمجھتے ہیں۔ لوہے کے دھبے جوہر کہلاتے ہیں اور آئینے لوہے کے بھی بنتے ہیں۔

یوں دیکھ کے اپنے غم سے مجھ کو رنجور
کہتا ہے سمجھ تو سہی گر کچھ ہے شعور
اتنا بھی نہ مر کوئی دنوں جیتا رہ
ملنا ہے تجھے پھر بھی جو مجھ سے منظور

اے درد اگرچہ مے میں ہے جوش و خروش
رہتے ہیں و لے اہل تامل خاموش
موجوں کو شراب کی وہ پی جاتے ہیں
گرداب کے مانند جو ہیں دریا نوش

مانا کہ شراب میں ہیجانی کیفیات ہیں۔ شور و شر ہے۔ لیکن اہل عقل و فہم بڑا نہیں اٹھتے۔ شاعر اہل تامل کو بھنور سے مثال دیتا ہے کہ اس میں تمام امواج دریا غرق ہو جاتی ہیں، سما جاتی ہیں۔ لیکن طلاطم پیدا نہیں ہوتا۔

اے درد یہ درد جی سے کھونا معلوم | جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن | میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

اے درد بہت کیا ہر کھا ہم نے | دیکھا تو عجب جہاں کا لیکھا ہم نے
بینائی نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کچھ | جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے

اے درد ہم نے بہت غور و خوض کیا۔ دنیا کا عجب الٹا دستور پایا۔ جب تک حواس خمسہ سے محروم رہے تھے۔ عالم عدم کا مشاہدہ کرتے تھے۔ آنکھ کھلی عالم محسوسات میں آئے۔ عدم پر پردے پڑ گئے۔ دوسرے معنی اس شعر کے یہ ہو سکتے ہیں کہ جب تک چشم بصیرت وا نہ تھی ہماری دنیا کی ہر چیز پر نظر تھی۔ جب سے دیدۂ دل وا ہوا دنیا پر پردے پڑ گئے۔

غم کھاتے ہیں اور آنسو نت پیتے ہیں | دن رات مجھے عجب طرح بیتے ہیں
گذرے ہے جو کچھ کہ گذرے ہی کیا کہئے | پر تھکی یہ کہ اب تک سب جیتے ہیں

جب سے توحید کا سبق پڑھتا ہوں
ہر حرف میں کتنے ہی ورق پڑھتا چلا
اُس عالم کی انتہا سمجھنا ہے آگے
اے درد ابھی تو نام حق پڑھتا ہوں

جب سے وحدت الوجود کا عرفان ہوا ہے۔ وحدت میں کثرت پاتا ہوں۔ ہر ذرے میں راز ہائے سربستہ مشاہدہ کرتا ہوں۔ اور ابھی تو خیر سے یہ سلسلہ شروع ہی کیا ہے واللہ اعلم انتہا کن منازل پر لے جائے "نام حق" نام خدا محاورہ ہے مثلاً ابھی تو نام خدا چودہویں برس میں ہے۔

اے درد سبھوں سے برملا کہتا ہوں
توحید نہ میں چھپا چھپا کہتا ہوں
ملا کو بھی نہ چاہیئے اس میں انکار
بندا بندا خدا خدا کہتا ہوں

دریا پہ عبث جائے ہو ساقی سے کہو
لے آئینہ دیکھ ظالم اس عالم کو
آنکھیں تری یوں نشے سے جاتی ہیں چڑھی
جوں کشتی چڑھاؤ پر چڑھی جاتی ہو

دنیا کی حقیقت جاننے کے لئے اس کے اتار چڑھاؤ پہچاننے کے لئے اپنی ہی ذات کا مطالعہ کافی ہے۔

کی بہت طریق زہد میں عمر تباہ
اب کیجئے دل کو معرفت سے آگاہ
جوں کوچہ مسواک اسی میں دیکھا
کوچہ ہے یہ سربستہ نہیں اس میں راہ

عبادت وریاضت مسلک زہد و ورع میں ایک عرصے تک زندہ

رہے۔ اس کوچے کی بھی خوب خاک چھانی۔ اب رموز معرفت کی طرف آیئے۔
اول الذکر راہ ایک حد تک پہنچا کر چھوڑ دیتی ہے اور سلسلہ معرفت لا انتنا ہی ہے۔
مسواک مولوی اور ملاؤں سے متعلق ہے۔ نیز دونوں جانب سے بریدہ ہوتی ہے
یعنی اس کا سلسلہ کٹا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں کوچۂ مسواک منہ کا وہ حصہ جس
میں مسواک پھرتی ہے اور وہ سر بستہ ہے۔ دونوں ہونٹوں سے بند۔

جس دل میں ہوس بھری وہ کب بیٹھ سکے
کب جس میں ہو دنیا کی طلب بیٹھ سکے
اُٹھ جائے نظر سے خلق تب بیٹھ سکے
تسکین شہودِ حق سے ہوتی ہے نصیب

جس طرح سے کٹ گئی یہ یوں کر کاٹی
مت پوچھ کہ میں نے عمر کیونکر کاٹی
دو روز کی زندگی ہے جوں کر کاٹی
کس واسطے چاہیئے پر لکھا اتنا

کب تک یہ کفر دل میں پھرتے رہیئے
ہر بت کے لئے کب تئیں مرتے رہیئے
اللہ کو اپنے یاد کرتے رہیئے
اب درد جو کچھ کہ زندگی باقی ہے

اے درد کب تک خواہشاتِ دنیا میں گھرے رہوگے۔ اب جتنی رہ گئی
ہے وہ یادِ خدا میں گذارو بس اس سے لو لگاؤ۔

ہے تجھ سے ہی اب حصول فیض باری
اے بحرِ علوم سب کو باری باری
جوں موج یہ سلسلہ رہے گا جاری
تا حشر تری مریدی و پیری کا

بحرِ علوم سے شاید حضرت علیؑ مراد ہیں۔ جن کی بابت سرورِ دو عالمؐ نے فرمایا ہے اِنِّی مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا

آزادیٔ معرفت نے اے درد کبھی عقدہ نہ کیا قبول جی پر کوئی
کیوں آتی اٹکے ہی ہر اب قیدِ حیات یہ بھی جو گرہ سی ہے وہ کھل جائے کبھی

آزاد منشانِ معرفت نے دل پر کوئی گرہ یا پیچ برداشت نہیں کیا۔ یہ بند حیات و پابندیٔ زیست کیوں اس کو بھی ایک دن ختم ہونا چاہیئے۔ یعنی یہ پردۂ آب و گل بھی اُٹھنا چاہیئے۔

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیاں کرے گا اس کو کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

یا اُس نے ہی کچھ رسمِ تغافل کم کی تاثیر بڑی ہے یا کہ اپنے غم کی
رونے کو مرے تولے ہے دو نظروں میں اس گوہرِ اشک کی بھی رتی چم کی

یا تو محبوب نے خوئے کج ادائی کم کر دی یا میری آہ کے اثر میں اضافہ ہوا۔ غرضکہ معشوق اب میرے آنسوؤں کی قدر کرنے لگا ستارۂ اشک عروج پر ہے۔

تیرے لئے درد کو کسی سے نہ بنی بہتیروں نے چاہا پہ سبھی سے نہ بنی
یہ خانہ خراب رفتہ رفتہ آخر ایسا بگڑا کہ اپنے جی سے نہ بنی

جوں کال سے یاں تال کی پیدائی ہے — ووں تال سے کال کی شناسائی ہے
دیکھی تنزیہ اور تشبیہ تمام — وہ اِس کے یہ اس کے یوں ہی کام آئی ہے

تال بمعنی وقت اور کال بمعنی زمانہ. زمانے کا ادراک سال وماہ وساعت ولمحہ سے لیا جاتا ہے. لیکن زمانہ حقیقتاً ان قیود سے باہر تاہم پہچانا ان ہی سے جاتا ہے. اس ہی طرح تنزیہ و تشبیہ ایک دوسرے کی معاون ومددگار ہیں. تنزیہ وتشبیہ قابل تشریح ہیں. عقلا کا ایک گروہ خدا کو مجرد منزہ مانتا ہے. دوسرا گروہ مجرد مشبہہ کا قائل ہے. تیسرا گروہ منزہ ومشبہہ دونوں مانتا ہے. مدعا یہ کہ وہ ذات پاک اس عالم صور سے منزہ بھی ہے اور مشبہہ بھی. مندرجہ ذیل شعر ان اصطلاحات کو سمجھنے میں مدد دے گا.

از خلق جدا ہستی و	ہم در ہمہ آئی	از جملہ مبرائی و	در جملہ در آئی
تنزیہ	تشبیہ	تنزیہ	تشبیہ

کچھ آپ ہی گرا کے آپ ہی چنتا ہے — کہتا ہے کچھ آپ آپ ہی کچھ سنتا ہے
اے درد ہمیشہ یہ دلِ دیوانہ — کیا کیا کچھ اُدھیڑتا ہے اور بنتا ہے

عاشق ہوئے جس کے اُس کے محبوب بنے — دلخواہ سب اس کے ساتھ اسلوب بنے
تس پر جو کچھ بنی سو دیکھی تم نے — بس درد خدا سے اب تمھیں خوب بنے

عشق کی انتہائے کامیابی یہ ہے کہ عاشق معشوق بن جائے اور معشوق عاشق
ع لیلےٰ اشد است مجنوں مجنوں خبر نہ دارد. ان کامیابیوں کے باوجود جو ہم پر بیتی

وہ اظہر من الشمس ہے یعنی تعلقات فانی ثابت ہوئے۔ سانس کے ساتھ سب ختم تھا۔ پس اب وہ تعلق پیدا کر جو باقی رہے۔

رباعیات مستزاد

اے درد شب قدر ہی ہر زلف رسا گر دل ہے ہمراہ
ہر خط میں لکھی ہوئی ہیں آیات خدا گر ٹک تو نگاہ
جوں آئینہ حیراں ہوں میں سر تا پا ہی عشق گواہ
آتا ہے نظر حسن میں جلوہ کیا کیا اللہ اللہ

گر شوق ہی جی میں حق کے پہچاننے کا ابرام کرو
کہتا ہوں سخن چھوٹا سا پر ماننے کا اک کام کرو
ہی غیر اگر تم میں تو لازم ہی تمھیں پہچانو اسے
ور تم ہی ہو تو فائدہ کیا جاننے کا آرام کرو

اگر معرفت خدا کے طلبگار ہو تو استقامت سے کام لو۔ مذبذب مت ہو۔ کم از کم ایک بات ماننے کے قابل کہتا ہوں۔ اس کو گرہ میں باندھ لو۔ اگر غیر خدا تم میں کچھ ہے۔ تو اس کا پتہ چلاؤ۔ اور اگر خدا کا جلوہ ہے تو اس سے بڑھ کر کیا آرام سے بیٹھو۔ مطلب یہ کہ جب تک اس ذاتِ واحد سے یگانگت حاصل نہ کر لو چین و سکون سے نہ بیٹھو۔ تگ و دو کرتے رہو۔ اپنے میں سے غیر اللہ کو نکال باہر کرو

کیسے تم کو بھاوت ہیں اور کیسے تو سکھ پاوت ہیں
یہ پھلواری دو دن کی ہیں کچھ اور سمود کھلات ہیں
کلیاں من میں سج چیت میں جیو پھول کوئی کھلات ہیں
جو دن وا پر بیت گیو ہیں وا دن ہم پر آوت ہیں

مخمسات

باطن سے جنھوں کے تئیں خبر ہے
ظاہر پہ انھیں تو کب نظر ہے

پتھر میں بھی عشق کا اثر ہے　　اس آگ سے سوختہ جگر ہے
ہر سنگ میں دیکھ تو شرر ہے

پتھر کو جب پتھر سے ٹکرایا جائے تو آگ دیتا ہے اُس میں سے چنگاریاں اور شرارے نکلتے ہیں۔ شاعر اس کو آتشِ عشق سے تعبیر کرتا ہے اور پتھر بھی جگر سوختہ آتش محبت ہے لیکن یہ آگ دل میں رکھتا ہے ظاہر نہیں ہونے دیتا اُوپر سے پتھر کا پتھر ہی رہتا ہے۔ اس ہی طرح اہلِ باطن الفت خدا دلوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں

خاموش ہو ترک گفتگو کر　　باطن کے صفا کی جستجو کر
حیرت میں وصالِ آرزو کر　　آئینۂ دل کو روبرو کر
دیدار نصیبِ ہر نظر ہے

جلوۂ خداوندی کسی ایک فرد یا ایک طبقے کے لئے مختص نہیں یہ جلوہ تو عام ہے بشرطیکہ آئینۂ دل میں صفا ہو۔ نیز حضرت خواجہ میر درد نے اس بند میں مختلف منازل سلوک کو بھی بیان کیا ہے۔ عارف کی اولین منزل بقول مولانا روم۔ خاموشی ہے۔ فرماتے ہیں۔ لب ببند و گوش بند و چشم بند۔ خواجہ میر درد کے مصرعہ اولیٰ میں یہی مفہوم ہے اس کے بعد صفائے باطن حاصل کی جاتی ہے بعدہٗ حیرت کی منزل آتی ہے جو منزل وصل بھی ہے یہاں عارف آئینۂ دل میں مشاہدۂ ذات الٰہی کرتا ہے پس ہر ایک سالک مسلک معرفت کو یہ منازل طے کرنی ہوتی ہیں۔

ہستی نے کیا ہے گرم بازار | لیکن ہے یہاں نگار درکار
سختی سے نہ رکھ قدم تو زنہار | آہستہ گذر میانِ کہسار
ہر سنگ دکان شیشہ گر ہے

پتھر سے شیشہ بنایا جاتا ہے۔ پس اہلِ نظر پتھر میں شیشے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس عالم فانی ہی میں عالم باقی مضمر ہے اس اسفل میں اعلیٰ پوشیدہ ہے۔ ہاں نگاہِ حقیقت آشنا درکار ہے۔

دیدار بنا ہے شاہدِ گل | اور زلف کشا عروسِ سنبل
جب دل نے مرے کیا تامل | تب پردۂ رنگ و بو گیا کھل
دیکھا تو بہار جلوہ گر ہے

نزدیک و بعید ہے برابر | مت ہو وہم اس سے مکدر
آئینہ وہم ہے سراسر | مانند نگہ نکل تو باہر
تیرے تئیں تجھ تلک سفر ہے

خدا سے دور حقیقتاً دوری نہیں وہ ذات تو انسان میں موجود ہے۔ صرف دیدۂ بینا درکار ہے۔

ہر عجز میں کبریا ہے محجوب | ہر نقص میں ہے کمال مطلوب
کوئی بھی نہیں جہاں میں معیوب | آتے ہیں مری نظر میں سب خوب
گر عیب ہے پردۂ ہنر ہے

عجز و انکسار میں اعتراف ذات بالا و برتر پنہاں ہے۔ ہر کمی کمال کا پیشہ خیمہ۔ اس لئے کہ نقص ہی کو کمال سے بدلا جا سکتا ہے۔ کمی نہ ہو تو تکمیل کا امکان نہیں۔ نہ دنیا کی کسی چیز کو برا کہہ۔ نہ کسی فرد کو مجھے تو سب ہی اچھے نظر آتے ہیں۔ عیب بھی ہنر کی پردہ داری کرتا ہے۔ مثلاً اکثر اہل اللہ تسطیر حال کے لئے اپنا ظاہر آلودہ بنا لیتے ہیں۔

اے درد رموزِ کبریائی　　کب سمجھے ہے زاہدِ ریائی
بے عجز نہیں ہے وہاں رسائی　　ہے مجھ کو جہاں پہ پر کشائی
پرواز شکستِ بال و پر ہے

ہم وحشیوں کے دل میں کچھ اور ہی اُمنگ ہے،　　وحشت بھری ہے اور ہی، اور ہی ترنگ ہے،
ان گمشدوں کے آگے تو عنقا بھی دنگ ہے،　　اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے،
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے،

لوح مزار جو حیات گذشتہ اور عالم ہستی کی ایک ادنیٰ نشانی ہے آزاد منشوں پر گراں گذرتی ہے۔

نے فکر صبح کی نہ غمِ شام تھا ہمیں　　نے شوق بادہ تھا نہ سرجام تھا ہمیں
جبتک عدم میں تھے عجب آرام تھا ہمیں　　اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

عالم عدم میں ہر خواہش، ہر آرزو اور ہر تمنا سے بالاتر تھے۔ آزاد تھے۔ حتے کہ اس ہستی سے بھی ناآشنا۔ جذبۂ خودنمائی نے اس عالم پر آلام میں لا پھنسایا

ع ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

نے یاں ہوائے آب ہے نے حرص نان کی
نے وحشت سفر نہ ہوس ہے جنان کی
زاہد یہ باتیں سب ہیں ترے امتحان کی
فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطرہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے

کئی قیمت ہیں اس کے پاس نقد دین کو لائے
کئی دُنیا دکھاتے ہیں کہ یوں سودا یہ بن جائے
ہمیں یہ سوچ ہے کہ وہ خود فروش ادھر اگر آئے
براہ اُوچہ دربازیم نے دینے نہ دنیائے
وُلے داریم و اندوہے سرے داریم و سودائے

صاحب ایمان اس کے روبرو ہدیۂ ایمان لائے۔ دُنیا والوں نے دنیا پیش کی۔ اسے تجنے کو کہا۔ ہم تہی دست اس فکر میں ہیں کہ اگر وہ ادھر آنکلا تو ہم کیا نذر گذرانیں گے۔ یہاں تو نہ دین ہے نہ دنیا۔ نہ باآنم نہ بااینم۔ اپنی بساط میں دلِ اندوہ گیں و سر سودا زدہ رکھتے ہیں۔ نہ یہ اس کے قابل نہ وہ اس کے لائق۔

نگران بیوقوفوں نے محبت سہل جانی
ہوس کرتا ہی پھرے عشق کی ہر ایک نیک و بد
وُلے یہ شعلۂ سرکش تو یوں گرمی کرے ہر کہ
نبازم چشم داغت را عجب بینائی دارد
بغیر از سینۂ پاکاں ندیدم خوش کند جائے

اہل ہوس نے عشق کو آسان سمجھا۔ لیکن چشمِ داغ عشق عجب دیدہ ور نکلی وہ صرف اہلِ دل ہی کے دل میں جاگزیں ہوئی۔

ستاتی ہے مجھے ہر لحظہ کج ادائی دوست | کرے ہے دشمنی اب مجھ سے آشنائی دوست
بھڑی ہے اور طرف جا کے دلربائی دوست | پہ تو بھی دل میں ہے میرے وہی صفائی دوست

وفا مری نہیں دیکھے ہے بیوفائی دوست

مجھے تو نزع میں گذری ہے صبح سو تا شام | پھر اب جو شام ہوئی صبح تک کسے آرام
غرض کہ مجھ کو ہوئی زندگانی تلخ تمام | کہے ہے سنکے مرا حال وہ مجھے کیا کام

نگاہ کیجیو ٹک رنگ بے وفائی دوست

ترکیب بند

شاہنشہِ ملک و کفر و دیں تو | ہے تخت نشینِ دل نشیں تو
ہوں لفظ نہیے آشنا میں ۱ | ہے معنیٔ لفظ آفریں تو
اے زیورِ دستِ غیب ہر جا ۲ | انگشت نما ہے جوں نگیں تو
کافر ہوں نہ ہوں جو کافرِ عشق ۳ | ہے نازِ بتانِ نازنیں تو
دشمن ہے کہاں کیدھر کو ہے دوست ۴ | ہے گرمیٔ بزمِ ہر دو گیں تو
ویرانیٔ وادیٔ گماں تو ۵ | آبادیٔ خانۂ یقیں تو
ہیہات جہاں یہ کور چشماں ۶ | ڈھونڈے ہیں تجھے تو ہے وہیں تو
کرتا ہے یہ کون دیدہ بازی ۷ | گر روشنیٔ نظر نہیں تو
تو ہی تو ہے دل کی بے حجابی ۸ | ہے پردۂ چشمِ شرمگیں تو

معشوق ہے تو ہی تو ہی عاشق
عذرا ہے کہاں کہاں ہے وامق

میں منتظرِ دمِ صبا ہوں ۱۱ جوں غنچہ گرفتہ دل بنا ہوں
یک عمر گذر گئی سمجھتے معلوم کیا نہ میں میں کیا ہوں
تنکا بھی تو مل سکا نہ مجھ سے ۱۱ شرمندۂ جذبِ کہربا ہوں
موجود نہ بوجھے کچھ وہ کافر ۱۲ گر آوے خدا بھی میں تو کیا ہوں
اپنی تو نہ کھوئی تیرہ بختی ۱۳ ہر چند کہ سایۂ ہما یوں
بیگانہ جو مجھ سے وہ پھرے ہے تقصیر یہی کہ آشنا ہوں
بیدل تو مجھے نہ کر سمجھ ٹک ۱۴ میں ہی تو بساط میں رہا ہوں
مشکل ہے مجھے کہیں رسائی کوتاہی طبع نارسا ہوں
پائی نہ گل وفا کی بو بھی اس باغ میں جا بجا پھرا ہوں

اسندہ نہ کیجئے محبت
دنیا ہی نبٹ ہے جائے عبرت

میرے دمِ سرد سے نہیں دور خورشید اگر ہو قرصِ کافور
ہوں داغ میں زخم دل کے ہاتھوں بہتا ہی رہا سدا یہ ناسور
پوچھے کوئی جس کی بات مجھسے ۱۵ کرنا ہے مجھے ترا ہی مذکور
ہے غم ہی ترا کہ روز و شب یوں رکھتا ہے ہمارے دل کو معمور
ایذا میں ہے دیکھ کیا حلاوت بے نوش نہیں ہے نیشِ زنبور
یہاں کھولیو تو سمجھ کے آنکھیں ۱۶ شمعِ مجلس ہے مثلِ شعلۂ طور
اتنا نہ ہوا میں اُڑ سلیماں ۱۷ کچھ تخت سے کم نہیں پر مور
قائل نہیں اختیار کا میں بندا ہے سمجھ میں اپنی مجبور

تو عشق کے رنگ سیر کر ٹک ق واصل ہے کوئی کوئی ہے مہجور

پروانہ و شمع مل گئے یوں

ہیں بلبل و گل جدا جدا دوں

اس زیست کا اعتبار کیا ہے
کوئی دم میں یہ زندگی ہوا ہے

گزرا ہے نظر سے ایک عالم ۱۸
یہ چشم نہیں ہے نقشِ پا ہے

ظالم ٹک ادھر تو دیکھ لے تو
کوئی پل میں خدا ہی جانے کیا ہے

ڈھاتا تو ہے دل کے تئیں ولیکن
تو جان یہ خانۂ خدا ہے

ہے دیدۂ فنا ہی حاصلِ چشم
عقدہ یہ حباب پر کھلا ہے

ظالم ہے تجھی سے تو یہ عالم
تو مجھ کو بتا کہاں چھپا ہے

دنیا سے اُمیدِ پائیداری
یہ وہم ترا کدھر گیا ہے

جوں آئینہ منہ کسی سے مت پھیر
تیرے دل میں اگر صفا ہے

کچھ پائی خبر نہ میں نے دل کی
کس کے وہ خیال میں گیا ہے

ہے میرے تئیں سراغ دل کا

پھرتا ہوں لئے یہ داغ دل کا

مت کہہ کہ فلک میں ہیں بجے ڈھنگ ۱۹
کس کا ہے سمجھ تو ٹک یہ نیرنگ

اے رشکِ بہار ہے تجھی سے
یہ روئے زمیں یہ آب اور رنگ

برعکس سمجھ صفا کو اس کی
آئینے کے دل میں ہے بھرا زنگ

اے شیشہ گراں نہیں یہ مینا
پگھلا ہے شراب پر دل سنگ

گزرتا ہے جو صلح غیر سے تو
ہم سے ہے مکرر ارادۂ جنگ

حیرت کا تو میری یہ اثر ہے
وہ بھی مجھے دیکھ رہ گیا دنگ

میں پہنچوں خیال کی طرح وہاں
گر مجھ سے تو ہو ہزار فرسنگ

کرتا ہے یہ دل تو روز نالے — ہونے سے زیادہ تر خوش آہنگ
ہیں غنچۂ دل گرفتہ دل ۲۰ تو عقدہ کشائے خاطر تنگ

جوں زخم مجھے شگفتہ دل رکھ
۲۱
مت تیغ سے اپنی منفعل رکھ

عاشق ہے اور اضطرار کرنا — یک جا نہ کہیں قرار کرنا
ہم بھی ہیں اُمیدوار ہو کے — ایدھر بھی صبا گذار کرنا
اے عشق قسم ہے قتل گر ہیں — پہلے تو ادھر ہی وار کرنا
دل اس کی گلی کو جب چلے تو — میرا بھی ٹک انتظار کرنا
مینا کو نہ توڑ محتسب تو — میرے تئیں سنگسار کرنا
ظالم ہیں تری یہ چشم قاتل — عاشق سے انکھیں نہ چار کرنا
ہو میرے سوا یہ کس سے ناحق — اپنے تئیں یوں نزار کرنا
اے وعدہ خلاف کب تلک یہ — بے فائدہ انتظار کرنا
آشفتہ دلوں کو مت ستانا ق زلفوں میں نہ شانہ یار کرنا

وابستہ ہے اُن سے مو بمو دل
مت ٹوٹ پڑے کبھو کوئی دل

مدت تئیں عشق دل پہ در تھا — دیکھا تو عبث کا درد سر تھا
آنکھوں نے جدھر کی نیزہ بازی ۲۳ تھا دل ہی مرا کہ وہاں سپر تھا
زخمی نہ بچا تری نگہ کا — جو زخم تھا سو وہ کارگر تھا
ہو سامنے کون اس مژہ کے — میرا ہی تو یہ دل و جگر تھا
پوچھا میں کہ دل کو کیوں اُجاڑا — کہنے لگا خوب! اپنا گھر تھا
ہیں ہم بھی صبا ترے تو ہمراہ — مدت سے ارادۂ سفر تھا

اے نالہ پھرے ہے کیوں بھٹکتا　　تجھ میں بھی کہیں تو کچھ اثر تھا

کیوں رد و قبول میں ہے جھگڑا　　مجھ میں تو نہ عیب نے ہنر تھا

اے دیدۂ جہاں کہیں میں دیکھا　　وہ یار مرا ہی جلوہ گر تھا

خاموش ہو مست جستا کسو کو

آتا ہے نظر خدا کسو کو

---

(۱) تو حقیقت ہے اور میں مجاز ہیں۔ وہ لفظ ہوں جو معنی سے پہچانا جائے۔ اور تو وہ معنی ہے جو الفاظ کی تخلیق کرتا ہے۔ مدعا یہ کہ میں روشناسی کے لئے دوسروں کا محتاج ہوں اور تو متعارف کن عالم ہے۔ نیز لفظ سے یہاں مراد عالم شہود یعنی عالم اجسام ہے۔ اور معنی سے مراد عالم غیب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ عالم ممکنات عالم غیب سے غیر متعلق نہیں، اور عالم غیب وجہ تخلیق شہود ہے۔

(۲) انگشت نما ہونا۔ یعنی کسی طرف اشارہ کرنا۔ مہر یا نگین قرطاس کی حقیقت کی جانب یا جس کی جانب سے وہ فرمان یا قرطاس جاری کیا گیا ہو اس کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے تو مہر کی طرح اس فرمانروائے حقیقی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ انگشت نما ہونا اس شعر میں محاورے میں نہیں استعمال کیا گیا ہے

(۳) ناز بتاں میں جب کہ تو جلوہ کناں ہے تو پھر میں اگر ان کو دل نہ دوں تو کافر قرار پاؤں۔

(۴) میں دوستی اور دشمنی سب میں تجھے کارفرما پاتا ہوں۔

(۵) وہم وگمان کی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں بھی تو ہی ہے۔ اور خانۂ یقین

بھی تیرے ہی دم سے آباد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ علیٰ کُلِّ شَیئٍ محیط

(۶) یہ اندھے دنیا والے تجھے اپنے سے باہر ڈھونڈ رہے ہیں، اور تو ان کے اندر موجود ہے۔

(۷) اگر خانۂ چشم میں تو نہیں تو نورِ بصارت کیا ہے۔

(۸) دل کی بے حجابی میں بھی تو ہی پرتوفگن ہے اور چشم شرمسار کے پردے میں بھی تو ہی ہے۔

(۹) وامق و عذرا سب کہنے کو نام کو عاشق و معشوق ہیں حقیقتاً عشق کی ہر منزل اور ہر صورت میں تو ہی جلوہ گر ہے۔

(۱۰) صبا غنچے کے لئے وجہ انبساط ہے۔ میرا دل بھی کلی کی طرح گھٹا ہوا ہے اور تیرا منظر تیرا ہوا خواہ ہے۔ اس لئے کہ صبا کی طرح اس کے لئے موجب انبساط تو ہے۔

(۱۱) کہربا تنکہ کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ مجھ محروم جذب میں اتنی بھی کشش نہیں۔

(۱۲) منکرینِ خدا کی عقلوں پر ایسے پردے پڑے ہیں کہ میں تو کس شمار میں ہوں اگر خدا خود بھی آئے تو وہ ماننے والے نہیں۔

(۱۳) سیاہی۔ سیاہ بختی و بد طالعی کے مترادف ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ سایۂ ہما خوش طالعی کا موجب ہے۔ بادشاہ گر ہے۔ لیکن اپنی سیاہی دور نہ کر سکا (سایہ بہر صورت سیاہ ہوتا ہے) اس ہی طرح میں بھی باوجود انسان ہونے کے اپنی سیاہ بختی دور نہ کر سکا۔

(۱۴) دنیا میں تیرا والہ و شیدا ایک میں ہی تو رہ گیا ہوں۔ دیکھ میرا دل مت توڑ۔

(۱۵) میں ہر شے میں تیرا جلوہ پاتا ہوں اور اب یہ کیفیت ہے کہ مجھ سے کسی چیز کی بابت بھی دریافت کیا جائے میں تیرا ہی ذکر چھیڑ دیتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے ہر شے میں تو ہی تو نظر آتا ہے۔

(۱۶) بزم عرفان میں ذرا ہوشیار ہی سے آنکھیں کھولیو۔ کہیں "خر موسیٰ صعقاً" کے مترادف نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ یہاں کی ہر چیز اس کے جلوہ کی مظہر ہے۔

(۱۷) اے سلیماں اپنے تخت پر اتنا غرور نہ کر پر مور بھی یہی کام دیتا ہے

(۱۸) آنکھوں دیکھتے اتنے گذر گئے۔ یا آنکھوں میں سے ہو کر اتنے گذر گئے کہ اب آنکھ نقش پا کے مترادف ہو گئی ہے۔

(۱۹) گردش فلک کو الزام نہ دے اس کا چکر اختیاری نہیں کسی قادر کی قدرت سے ہے۔

(۲۰) دل کلیوں کی طرح بند ہیں۔ لیکن تو عقدہ کشا ہے۔

(۲۱) زخم منبسط و شگفتہ دل ہوتا ہے۔ نیز تیغ کا کام زخم لگانا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے دل پر تیغ کو اپنے دل کی نکالنے دے۔ یہ اس ہی کے لئے ہے۔ اگر اس سے پہلو تہی کی گئی تو انفعال ہوگا۔

(۲۲) شریعت اسلام میں ایک سزا ہے۔ سنگسار کرنا۔ جو زانی کے واسطے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مینا کا اور میرا تعلق ہے تو مجھ پر حد قائم کر لے۔ مینا کو نہ توڑ۔

(۲۳) آنکھوں نے جدھر بھی تیر نظر برسائے دل وہیں سپر بن کر جا موجود ہوا۔ ثبوت یہ کہ ہر تیر میرے دل کے پار ہوا۔

احوالِ واقعی

السّعی منّی۔ تائید ایزدی شامل حال تھی۔ شرح دیوان درد تکمیل پا گئی۔ جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ شرح اغلاط سے مبرا نہیں۔ نیز اکثر اشعار تشنۂ معنی رہ گئے ہوں گے۔ قارئین سے استدعا ہے کہ اگر کوئی غلطی یا قصور نظر آئے تو از راہِ کرم مطلع فرمائیں تاکہ دوسری اشاعت میں تصحیح و تکمیل کر دی جائے۔ نیز فیض صاحب جھنجھاوی کا شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے شرح کو بہ نظر اصلاح دیکھا۔ اور اکثر جگہ اس ہیچمداں کی رہنمائی کی۔

خواجہ محمد شفیع دہلوی